SR-2020-XIV-OR

بلوچستان: صورتِ حال اور اقدامات

سیمینار رپورٹ

Institute of Policy Studies
Islamabad

© 2020
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

جملہ حقوق محفوظ ہیں

زیرِ نظر رپورٹ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد اور بلوچستان بار کونسل کے زیرِ اہتمام منعقدہ سیمینار [۱۳ اپریل ۲۰۱۷] کے مباحث پر مشتمل ہے۔ سیمینار میں بلوچستان کے سیاسی، سماجی، قانونی اور دانشور حلقوں سے تعلق رکھنے والی نمایاں شخصیات نے شرکت کی اور اپنے خیالات پیش کیے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔
اس رپورٹ میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

معلومات اور آراء کے لیے:

info@ips.net.pk

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد
نصر چیمبرز، 1-ایم پی سی ایچ ایس، کمرشل سنٹر، ای-الیون/تھری، اسلام آباد
فون: +92-51-8438391، فیکس: +92-51-8438390

فہرست

تعارف		05
ابتدائی کلمات		10
راحب خان بلیدی ایڈووکیٹ	چیئرمین ایگزیکٹیو کمیٹی بلوچستان بار کونسل	
اہم نکات		11
اظہار خیال		
محمد اسلم بھوتانی	سابق اسپیکر، بلوچستان اسمبلی[۲۰۰۸-۲۰۱۲]	14
عبدالحکیم بلوچ	سابق چیف سیکریٹری حکومت بلوچستان	17
امان اللہ کنرانی ایڈووکیٹ	سابق سینیٹر، ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان	19
منیر احمد بادینی	سابق چیف سیکرٹری حکومت پاکستان، سیکریٹری برائے کھیل، ماحول اور امور نوجوانان، حکومت بلوچستان	25
ڈاکٹر اسحٰق بلوچ	رکن مرکزی کمیٹی نیشنل پارٹی	30
قاضی عبدالحمید شیرزاد	ایڈووکیٹ ہائی کورٹ	35
شام کمار	دانشور اور مصنف	37
یار جان بادینی	دانشور اور صحافی	41
صدیق بلوچ	ایڈیٹر، روزنامہ آزادی اور ڈیلی بلوچستان ایکسپریس	46
امین اللہ فطرت	اسٹاف رپورٹر، روزنامہ جنگ کوئٹہ	50
عبدالرؤف مینگل	رہنما بلوچستان نیشنل پارٹی[مینگل] سابق رکن قومی اسمبلی[۲۰۰۲-۲۰۰۶]	52
ہدایت الرحمٰن بلوچ	سیکریٹری جنرل، جماعت اسلامی بلوچستان	57
منظور بلوچ	لیکچرار، بلوچستان یونیورسٹی	60
فاروق سرور	ایڈووکیٹ، کالم نگار	65
امان اللہ شادیزئی	دانشور و صحافی، سابق صدر، کوئٹہ یونین آف جرنلسٹ	66
سلیم شاہد	صحافی، بیورو چیف ڈیلی ڈان	68
صابرہ اسلام ایڈووکیٹ	نیشنل پارٹی	71

ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ | سابق صدر نیشنل پارٹی، سابق رکن قومی اسمبلی [۱۹۷۰-۱۹۷۷] وسابق سینیٹر [۱۹۹۷-۲۰۰۰] | 74

اختتامی کلمات | 77

خالد رحمٰن | ایگزیکٹو پریذیڈنٹ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

فہرست شرکاء | 84

تعارف

بلوچستان کا رقبہ ۳۴۷۱۹۰ مربع کلومیٹر ہے جو پاکستان کے کل رقبے کا ۴۴ فیصد ہے۔ ۲۰۱۷ کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ایک کروڑ ۲۳ لاکھ ۴۴ ہزار ۴۰۸ افراد پر مشتمل ہے اور یہ پاکستان کی کل آبادی کا تقریباً ۶ فیصد ہے[1]۔ صوبہ بلوچستان کی سرحدیں شمال میں افغانستان، مغرب میں ایران، مشرق میں پاکستان کے تینوں صوبوں اور جنوب میں بحیرہ عرب سے ملتی ہیں۔ بلوچستان کا ساحل ۷۶۰ کلومیٹر طویل ہے اور اس پر گوادر، پسنی اور سونمیانی کی بندرگاہیں بھی واقع ہیں۔ منفرد محل وقوع اور ساحل کی بنا پر یہ دنیا کے مغرب کو مشرق سے ملانے کے لیے ایک مختصر راستہ فراہم کرتا ہے۔ بلوچستان کی سرزمین معدنیات سے مالا مال ہے یہاں پر تیل و گیس، سونا، تانبا، کوئلہ کرومائیٹ، لوہا، سلفر سمیت دیگر معدنیات کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔

مقامی لوگوں کے لیے تو یہاں کا باسی ہونے کی بناء پر علاقہ کے ساتھ وابستگی کی فطری اہمیت ہے۔ مگر اپنے جغرافیائی محل وقوع، اسٹریٹجک اہمیت اور معدنیات کے وسیع ذخائر کی بدولت یہ دنیا کی بڑی قوتوں کے لیے بھی غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہے۔ بالخصوص گوادر کی تجارتی و تزویراتی (strategic) اہمیت نے بحیرہ عرب میں بالادستی کے حوالے سے مختلف عالمی اور علاقائی قوتوں کے لیے امکانات اور خطرات پیدا کیے ہیں۔ گوادر بندرگاہ کی تعمیر اور اس سے متعلقہ پاک چین اقتصادی راہداری کے معاہدے (CPEC) کو جہاں بعض قوتیں اپنی بالادستی کے لیے خطرہ سمجھتی ہیں وہیں کئی دیگر اس کے تجارتی امکانات کے باعث خطے کے معاشی مرکز کے یہاں منتقل ہونے سے خوش نہیں ہیں۔

دوسری جانب قیام پاکستان سے لے کر اب تک صوبہ بلوچستان اور مرکز کے تعلقات مشکلات کا شکار رہے ہیں۔ اس صورت حال نے صوبہ کو مسلسل عدم استحکام کا شکار رکھا ہے۔ ان مشکلات سے صرفِ نظر اور کسی حقیقی پائیدار حل کی جانب بڑھنے کے بجائے وقت گزاری پر مبنی رویہ، سرد مہری اور بداعتمادی کا نتیجہ ۱۹۴۸، ۱۹۵۸، ۱۹۶۳، ۱۹۷۳ اور اب ۲۰۰۵ سے جاری پانچ مزاحمتوں اور فوجی آپریشنز کی صورت میں نکلا۔ اس تمام عرصے میں طاقت کے بار بار کے استعمال، مؤثر مذاکرات نہ ہونے، عہد شکنیوں اور حقِ حکمرانی کی کشمکش نے ایک جانب صوبہ اور مرکز کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا اور دوسری جانب خود بلوچوں کو بھی فیڈریشن کے حامی اور مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اس دوران مرکز

[1] واضح رہے کہ اس مردم شماری کے نتائج کا ابھی تک سرکاری طور پر اعلان نہیں کیا گیا۔

مخالف گروہوں کے مطالبات بھی حق حاکمیت، وسائل پر اختیار اور وسیع تر صوبائی خود مختاری سے آزادی کے مطالبے تک جا پہنچے۔ اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صوبے کے سیاسی منظر نامے میں بداعتمادی، احساس محکومی و محرومی، غیر یقینی اور شکوک و شبہات کے عناصر نمایاں ہیں۔ دونوں جانب دوریاں اور غلط فہمیاں بڑھتے بڑھتے شدید تلخیوں کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔

اس تمام تر بحران کے مختلف پہلوؤں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں تہہ در تہہ کئی عوامل کارفرما ہیں۔ بلوچ قیادت شروع دن سے مقامی سطح پر حق حکمرانی اور مرکز کی سطح پر مؤثر شراکت داری کا مطالبہ کرتی آ رہی ہے۔ مگر قیام پاکستان کے بعد ایک مختصر عرصے میں ہی ہمارے بانی قائدین کے بچھڑ جانے سے معاملات روایتی سیاست دانوں، سول و فوجی بیوروکریسی پر مشتمل ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں آ گئے جن میں سے بیشتر کی ترجیحات قومی مفاد اور بہبود کے بجائے محض ذاتی اقتدار اور طاقت ہی تھیں۔ انہوں نے بلوچ قبائل کی باہم تقسیم کو بالعموم اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا اور دوسری جانب مقامی و مرکزی ہر دو سطح پر اس حکمران طبقے میں بلوچوں کی نمائندگی محدود رہی۔ اس سے بلوچستان سے متعلق معاملات یا ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئے جو اپنے مخصوص انفرادی اور گروہی مفادات کے تحت سرگرم رہے اور یا ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے جن کو نہ تو بلوچ معاشرے و نفسیات کا علم تھا اور نہ ہی بلوچستان سے دلچسپی۔ آئینی طور پر اعلیٰ ترین عہدہ یعنی گورنر کے لیے بعض اوقات غیر بلوچستانی لوگ تعینات کیے جاتے رہے۔ یہی صورت صوبے کے اعلیٰ انتظامی عہدے مثلاً آئی جی پولیس، ڈی آئی جی، آئی جی ایف سی، چیف سیکریٹری وغیرہ کی رہی ہے۔

سیاسی نمائندگی اور احساس شرکت بذات خود بہت اہم ہے لیکن صورت حال کے بگاڑ میں اس حقیقت نے بھی ایک بڑا کردار ادا کیا کہ پسماندگی کے اعتبار سے بلوچستان ملک بھر میں سب سے آگے ہے۔ تعلیم، صحت، پینے کے صاف پانی اور نکاسی آب کی سہولتیں ہوں یا بجلی اور گیس* کی فراہمی یا مواصلات کی سہولتیں، بلوچستان پر بالعموم کم ہی توجہ دی گئی ہے۔

اس تمام تر صورتحال میں بلوچستان کی سیاسی قیادت اور دانشوروں میں عمومی طور پر یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کو بدستور ایک 'نوآبادی' کے طور پر چلایا جا رہا ہے اور یہ احساس محکومی و محرومی بڑھتے بڑھتے مرکز گریز رویوں کی صورت اختیار کرتا گیا۔ اس دوران ہر دو طرف سے فاصلے اتنے بڑھتے گئے کہ ایک دوسرے کے ہر اقدام و مطالبے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اس بداعتمادی کی فضا میں بلوچستان سے اٹھنے والی آوازوں کو 'بغاوت' سے تعبیر کیا گیا۔ مسائل کے حل کی بجائے طاقت کے استعمال نے معاملات کو مزید گھمبیر شکل دی اور اس کے نتیجے میں بحران در بحران جنم لیتے گئے۔

آج بلوچستان میں پانچویں مزاحمت جاری ہے۔ اور اگر ہم حالیہ اور گزشتہ تمام مزاحمتوں کی وجوہات کا جائزہ لیں تو ان کے پیچھے صوبے اور مرکز کے درمیان پیدا ہونے والی بدگمانیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ناراض بلوچ قیادت کا مؤقف ہے کہ ۱۹۴۸ میں جب کچھ بلوچ حلقوں میں

* گیس کا معاملہ بالخصوص اس اعتبار سے بہت حساس ہے کہ گیس ۱۹۵۲ میں بلوچستان کے علاقہ (سوئی) سے دریافت ہوئی۔ چند ہی برسوں میں یہ ملک کے دوسرے صوبوں میں کراچی، لاہور، اسلام آباد یا پشاور تک پہنچا دی گئی لیکن کوئٹہ تک اسے فراہم ہونے کے لیے ۱۹۸۵ تک انتظار کرنا پڑا جبکہ بلوچستان کا بہت سا علاقہ آج بھی اس سے محروم ہے۔

غیر مشروط الحاق سے متعلق تحفظات پائے جاتے تھے اور وہ کچھ باضابطہ ضمانتیں چاہتے تھے تو بجائے ان تحفظات کو دُور کرنے کے جلد بازی کی گئی۔ اس کشیدہ ماحول نے خان قلات کے چھوٹے بھائی اور مکران کے گورنر شہزادہ عبدالکریم کی سرکردگی میں پہلی مزاحمت کی راہ ہموار کی۔ اس موقف کے تسلسل میں ہی یہ بات کہی جاتی ہے۔ خان قلات میر احمد یار خان کی ۱۹۵۰ کی دہائی میں اپنی ریاست کی بحالی کی کوششیں کوئی غداری نہیں بلکہ ریاست قلات کے پاکستان سے الحاق کے معاہدے کے عین مطابق تھیں مگر بجائے اس کے کہ معاملات کو مذاکرات سے حل کیا جاتا ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے قیام پاکستان میں اہم کردار ادا کرنے والے رہنما میر احمد یار خان کے محل پر حملہ ہوا اور ان پر بغاوت کے الزامات لگا کر ان کو نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۵۸ میں نواب نوروز خان زہری نے مزاحمت شروع کی۔ اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے ان سے مذاکرات کے بعد جس طرح عہد شکنی کی گئی اس نے بلوچ نفسیات پر ایک ایسا نقش چھوڑا جس سے آج تک ناراض حلقے وفاق پر اعتبار کو تیار نہیں۔ اسی طرح ۱۹۶۰ کی دہائی میں بھی قبائلی نفسیات اور بلوچ روایات کو جانے بغیر اپنی پسند کی پالیسیاں نافذ کرنے کی جو سعی کی گئی اس کے نتیجے میں بلوچستان میں شورش بڑھتی رہی اور اس کا دائرہ بھی بڑھتا گیا۔

۱۹۷۰ میں بلوچستان کو صوبے کا درجہ ملنا ایک مثبت فیصلہ تھا۔ لیکن جب وہاں کی قیادت انتخابات کے نتیجے میں ایک حکومتی شراکت دار کے طور پر ابھری اور صوبے میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو بجائے اس کے کہ اس موقع سے ملی تعمیر و شراکت کے حوالے سے فائدہ اٹھایا جاتا ایک بار پھر غداری اور بغاوت کے الزامات لگا کر منتخب صوبائی حکومت کو برطرف کیا گیا۔ اس عمل اور اس کے نتیجے میں شروع ہونے والی مزاحمت نے نہ صرف بعض اہم بلوچ رہنماؤں کو ہمیشہ کے لیے پارلیمانی سیاست سے دور کر دیا بلکہ ۱۹۷۳ کا مشترکہ آئین بھی قومی اسمبلی کے بلوچستان سے تعلق رکھنے والے پانچ میں سے تین ارکان کی توثیق سے محروم رہا۔ حالیہ شورش نے نواب اکبر خان بگٹی کی شہادت [۲۰۰۶] کے بعد زور پکڑا۔ اکبر بگٹی بلاشبہ بلوچ قیادت میں اہم مقام کے حامل تھے۔ اپنے وقت میں بلوچستان کی اس بڑی قدآور شخصیت کو جن حالات کا شکار بنا کر ہلاک کیا گیا اس سانحہ کے اثرات سے بلوچستان آج تک نہیں نکل پایا۔ بلاشبہ اس کے نتیجے میں اندرونی اور بیرونی شورش پسند قوتوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا جس کی وجہ سے بحران کا حل نہیں نکل پا رہا ہے۔

دوسری جانب بلوچستان کے اندرونی عوامل سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف ادوار میں جن ناانصافیوں کا ذکر کیا جاتا ہے ان تمام معاملات میں ہر دور میں کوئی نہ کوئی بلوچ رہنما بھی مرکز کا معاون کار رہا ہے۔ یعنی جن لوگوں کو وفاق کی قربت نصیب بھی ہوئی تو بجائے اس کو اپنے عوام کی فلاح اور صوبے اور مرکز کے درمیان پل بننے کے لیے استعمال کرنے کے انہوں نے اپنے ذاتی و گروہی مفادات کو ترجیح دی۔ اور حکومت کو اپنے سیاسی و قبائلی مخالفین کے خلاف شہ دے کر دوریوں اور غلط فہمیوں کو تصادم کی نہج تک لے گئے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہمیں ایک ایسا طبقہ بھی نظر آتا ہے جو نسل در نسل برسر اقتدار ہے مگر ان کے علاقوں کا حال بھی باقی بلوچستان سے شاید کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبہ کی پسماندگی اور مقامی آبادی کی بدحالی میں خود بلوچستان کے بعض سرداروں اور ان کی زیر قیادت قائم حکومتوں کی نااہلی اور بدعنوانی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ایسے میں آج کی صورت حال کے ذمہ داروں کے درست تعین میں بلوچستان کے اندر ایک جائزے اور جواب دہی کی ضرورت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ گزشتہ دہائی میں سیاسی اور فوجی قیادت کی طرف سے بلوچستان کے خصوصی حالات کو دیکھتے ہوئے محرومیوں کے خاتمے، ترقی کے مواقع فراہم کرنے اور ناراض بلوچ قیادت کو قومی دھارے میں لانے کے متعدد اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔ اس حوالے سے حکومتی و وفاقی سطح پر اٹھارویں ترمیم کے ذریعے صوبائی خود مختاری، آغاز حقوق بلوچستان پیکیج، این ایف سی ایوارڈ کا از سر نو تعین اور فوج کی جانب سے بلوچستان کے نوجوانوں کے لیے فوج میں مخصوص بھرتی جیسے اقدامات اٹھائے گئے جن کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی۔ یہ اقدامات اگرچہ کافی نہ ہوں مگر انتہائی اہم اور بنیادی نوعیت کے ضرور ہیں جن سے مستقبل کا لائحہ عمل طے ہونا ہے۔ تاہم بداعتمادی، ذہنی فاصلوں اور ایک دوسرے کی نیتوں پر شک کی وجہ سے ان مثبت اقدامات کے نتائج اور اثرات بھی اس طرح سے سامنے نہیں آئے جس طرح سے امید کی جارہی تھی۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان فاصلوں اور بداعتمادیوں کو رابطوں اور بات چیت کے ذریعے دور کیا جائے تاکہ مستقبل میں تعاون کی نئی راہیں تلاش کی جاسکیں۔

اس پس منظر کے ساتھ اگر ہم آج کی صورتحال پر غور کریں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اندرونی شورش کے ساتھ ساتھ بیرونی قوتوں کی سرایت سے اب بلوچستان میں جاری کشمکش ایک بین الاقوامی عنوان کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ۲۰۱۳ میں CPEC کے اعلان اور پھر اس حوالہ سے اقدامات نے نئے امکانات اور خدشات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی عناصر کی دلچسپی کو بھی اور زیادہ بڑھادیا ہے۔ خطہ میں موجود اور خطہ سے باہر پاکستان دشمن عناصر اس صورت حال سے ہر ممکن فائدہ اٹھانے کے لیے جارحانہ انداز میں سرگرم ہیں۔

ایسے میں چیلنجوں کا سامنا کرنے اور بلوچستان میں جاری کشمکش کے پائیدار حل کے لیے ضروری ہے کہ ملکی پالیسی ساز حلقوں اور بلوچستان کی قیادت کے درمیان مؤثر رابطہ کاری اور مکالمے کی راہ ہموار کی جائے تاکہ دوریوں، بداعتمادیوں اور غلط فہمیوں کا سدباب ہوسکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک و عوام کے مفاد میں تمام سٹیک ہولڈرز کو ایک دوسرے کو سننا ہوگا۔ سیاسی مسائل کو طاقت کے ذریعے حل کرنے کی کوششوں کے بجائے بلوچ قوم پرست عناصر ہوں یا قومی و صوبائی سطح پر پالیسی ساز حلقے، سب کو یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ سننے اور سنانے اور بات چیت کے عمل سے ہی مستقبل کا لائحہ عمل طے ہوسکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک قدم اٹھاتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی جانب سے بلوچستان بار کونسل کے اشتراک سے کوئٹہ میں ایک خصوصی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پیش نظر یہ تھا کہ بلوچستان کے حوالے سے غیر حکومتی نقطہ نظر کو وہاں کی متنوع سیاسی قیادت اور متحرک اہل علم افراد کی زبانی سنا اور سمجھا جائے اور ارباب اختیار اور پالیسی سازوں کے سامنے اسے پیش کیا جائے تاکہ اس سے مستقبل میں موثر مکالمے کی راہ ہموار ہو۔ زیر نظر دستاویز اسی سیمینار کے مباحث پر مشتمل ہے۔

بلوچستان کے بارے میں شائع ہونے والی رپورٹوں اور تجزیوں کی کوئی کمی نہیں ہے یوں دیکھا جائے تو اس سیمینار میں زیر بحث آنے والے بہت سے نکات بھی نئے نہیں ہیں اور بعض اوقات ایک ہی نکتہ کی تکرار بھی محسوس ہوسکتی ہے۔ چنانچہ یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ کوئی نئی تحقیقی دستاویز نہیں ہے۔ اس دستاویز کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس سے مختلف اہم ایشوز کے ساتھ ساتھ بلوچستان کی موجودہ کیفیت، جذبات اور لب

ولہجہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ زبان وبیان میں ضروری ادارتی تبدیلیاں تو ناگزیر ہوتی ہیں لیکن اسی نقطۂ نظر سے ہم نے کوشش کی ہے کہ سیمینار میں شرکاء کی جانب سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کے بنیادی متن کو جوں کا توں اور اسی ترتیب میں کاغذ پر منتقل کر دیا جائے جس میں وہ اصل میں پیش ہوا ہے۔ اس پورے عمل کی تکمیل میں مختلف مراحل پر تعاون کے لیے ہم اپنے ساتھیوں سمند خان اور طاہر عباسی کے خصوصی طور پر مشکور ہیں۔

ابتدائی کلمات

راحب خان بلیدی ایڈووکیٹ

چیئرمین ایگزیکٹو کمیٹی

بلوچستان بار کونسل

میں سب سے پہلے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ڈائریکٹر جنرل خالد رحمٰن کا شکر گزار ہوں جنہوں نے بلوچستان بار کونسل کو یہ اعزاز بخشا اور ان کی مہربانیوں کی بدولت آج ہم نے بلوچستان بھر کے تمام ادیبوں، دانش وروں، سیاسی کارکنوں، سیاسی مفکروں اور وکلاء کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا کہ وہ بلوچستان کے بنیادی مسائل کے بارے میں اپنا اظہار خیال کریں۔

میرے بلوچستان کے بنیادی مسائل وہ مسائل ہیں جن پر ابھی تک ارباب اختیار واقتدار نے کبھی سنجیدگی سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ بلوچستان جو کہ معدنی وسائل سے مالا مال صوبہ ہے آج بھی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہے۔ سی پیک دنیا میں رابطوں کا ایک بہت بڑا منصوبہ ہے جو کہ گوادر کے مقام پر بننے جا رہا ہے لیکن گوادر کے عوام آج بھی پینے کے صاف پانی سے محروم ہیں۔ چاغی میں واقع سینڈک کے مقام پر سونا نکلتا ہے لیکن چاغی آج بھی بنیادی سہولیات سے محروم ہے۔

بلوچستان کے عوام احساس محرومی کا شکار ہیں۔ ملک کے اندر بدامنی کی بڑھتی ہوئی لہر سے جہاں پورا ملک متاثر ہوا ہے وہاں سانحہ ۸ اگست [۲۰۱۶] وکلاء پر ہونے والا حملہ تاریخ کا ایک بھیانک عمل ہے۔ آج کی کانفرنس میں پورے بلوچستان کے اہل قلم ودانش کی موجودگی ہے، ہم توقع کر سکتے ہیں کہ یہاں مسائل کی بے لاگ نشان دہی ہوگی۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی جانب سے اپنے دائرہ میں ان مسائل کی نشان دہی کے لیے اقدامات قابل ستائش ہیں۔ امید رکھتا ہوں کہ آج کی اس کانفرنس کے نتائج آنے والے دنوں کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے اہمیت کے حامل ہوں گے۔

سیمینار میں سینئر سیاست دانوں، سابق اراکین پارلیمنٹ و صوبائی اسمبلی، سابق سول سرونٹس، سینئر وکلاء، دانش وروں اور میڈیا ماہرین نے شرکت کی۔ سیمینار میں زیر بحث آنے والے درج ذیل نکات ان مختلف پس منظر رکھنے والے بلوچ ماہرین پر مشتمل چنیدہ گروہ کی جانب سے اٹھائے جانے والے مسائل اور شکایات کا خلاصہ ہیں۔ قابل ذکر طور پر جہاں تمام شرکاء کی جانب سے مایوسی اور ناراضگی کا اظہار کیا گیا وہیں نقطہ ہائے نظر میں انتہا اور اعتدال کے حوالے سے تنوع بھی موجود تھا۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ خیالات، احساسات اور جذبات کو سمجھنے کے لیے باتوں کو اسی شکل میں تحریر کیا جائے جس میں ان کا اظہار ہوا اور مکالمہ کی کسی بھی کوشش میں اس ماحول کو پیش نظر رکھا جاسکے۔

اہم نکات

سیمینار میں ہونے والی بحث کی تلخیص

- ہمیں اپنی ثقافت سے محروم کیا جارہا ہے۔ ریاست کو بلوچستان کے لوگوں میں نہیں بلکہ یہاں کی زمین اور وسائل میں دلچسپی ہے۔ ہم اپنی زمین پر اپنا نظام چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ مفتوحوں والا سلوک کیا جارہا ہے اور اسی حیثیت میں ہم سے اپنی ثقافت، شناخت، اقدار اور حتی کہ معیشت بھی ترک کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ ہمارے ساتھ ایک قوم جیسا سلوک نہیں کیا جاتا۔
- بلوچستان بلوچوں کی سرزمین ہے۔ ہمیں یہاں اقلیت میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ مردم شماری سمیت گوادر میں انتقال آبادی اور پراپرٹی کے کاروبار میں ماورائے قانون سرمایہ کاری کے مسائل ہیں۔ خدشہ ہے کہ گوادر منصوبے کی وجہ سے بلوچ اپنی ہی زمین پر اقلیت میں بدل جائیں گے۔
- ہمیں ان زمینوں پر آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت نہیں جو صدیوں سے ہماری ملکیت ہیں۔ غیر مقامی افراد ہماری نقل و حرکت کو دیکھتے ہیں۔ ہر جگہ تلاشی کے لیے چوکیاں قائم ہیں۔ ان غیر قامی افراد کے لیے ہم نہیں، ہمارے شناختی کارڈ زیادہ اہم ہیں۔ یہ ہماری تضحیک کرتے ہیں۔
- ہمارے لوگ، نوجوان اور حتی کہ خواتین تک سالوں سے لاپتہ ہیں، جن میں بہت سے اپنا جرم جانے بغیر مارے جاچکے ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی یا تو اس سے متاثر ہوا ہے یا کم از کم ایسے کئی واقعات کی معلومات رکھتا ہے۔
- انگریزوں نے قبائلی نظام کو قبول کیا۔ وہ قبائلی معتبرین کے ساتھ شائستگی اور احترام کے ساتھ معاملات طے کرتے تھے اور ان کی رسوم وثقافت کو مد نظر رکھتے ہوئے گنجائش پیدا کرکے اپنے مفادات خوشگوار ماحول میں طے کرتے تھے۔ آج سب کچھ زور اور طاقت کے بل پر مسلط کیا جارہا ہے۔ نواب اکبر بگٹی کے ساتھ سوئی کا مسئلہ بآسانی بات چیت کے ذریعے حل کیا جاسکتا تھا مگر ان کو موقع دینے کی بجائے مار دیا گیا۔ یہ ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ قیمتی قدرتی وسائل زمین کے نیچے دفن رہیں

تو بہتر ہے وگرنہ یہ دریافت ہوئے اور نکالنے کا عمل شروع ہوا تو ہم جان سے جائیں گے۔ اکبر بگٹی اور خیر بخش مری وہ دور ہنماء تھے جنہوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا، اس کے باوجود ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ ہمارے لیے ایک مثال ہے۔

- بلوچستان کو مرکز نے ہمیشہ ڈویلپمنٹ پیراڈائم کے بجائے سیکوریٹی پیراڈائم سے چلایا ہے۔
- پارلیمانی نظام میں جب تک پنجاب کی بالادستی قائم ہے، چیزیں کبھی تبدیل نہیں ہوں گی۔ حتیٰ کہ سینیٹ میں جہاں سب کی برابر نمائندگی ہونی چاہیے، اسلام آباد کی تین نشستیں ان کی [پنجاب] تعداد بڑھا دیتی ہیں۔ اسی طرح فاٹا کی آٹھ نشستوں کو ملا کر خیبر پختونخوا کی نشستیں بھی بڑھ جاتی ہیں۔
- پاکستان جیسے وفاق میں قدرتی وسائل پر اختیار صوبوں کے پاس ہونا چاہیے۔ بلوچستان کے معاملے میں یہ مزید ضروری ہے کیونکہ یہاں زراعت کم ہے۔ اٹھارہویں ترمیم سے صورت حال میں کچھ بہتری ضرور آئی ہے مگر اس کے باوجود کسی تنازعے کی صورت میں معاملات کو طے کرنے کا میکنزم نہیں۔ سی سی آئی اگرچہ ایسی صورت میں تنازعات حل کرنے والا ادارہ ہے مگر وہ بھی فعال نہیں۔ اس کے اجلاس نہیں بلائے جا رہے اور اس کا کوئی مستقل سیکریٹریٹ نہیں جو کہ آئینی طور پر ہونا چاہیے۔ آبادی کو وفاقی محصولات کی تقسیم کا معیار بنانا بھی زیادتی ہے۔
- چین کے اپنے مفادات ہیں۔ ان کی ضرورت خود کو تیل کی بغیر کسی رکاوٹ کے ترسیل اور ہمارے علاقوں سے معدنی وسائل نکالنا ہے۔ سیندک ایک مثال ہے کہ جب کچھ عرصہ کے لیے مقامی طور پر چلایا جا رہا تھا [یعنی ملازمین میں سے تقریباً ستر فیصد مقامی تھے] تو یہ پیسہ بھی کما رہا تھا۔ اب مرکز کی جانب سے کیے گئے معاہدے کے تحت سب کچھ جو سیندک میں ہے ان کے [چینیوں] حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس کی عملاً کوئی نگرانی نہیں۔ جہاں تک ہمارے استعمال کا تعلق ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ٹیتھیان کارپوریشن ہو یا کوئی چینی کمپنی۔
- سی پیک کے تحت بلوچستان میں توانائی کے جو منصوبے لگائے جا رہے ہیں ان کے ماحولیاتی اثرات ہمارے لیے ہوں گے جبکہ فائدہ پنجاب اور دیگر علاقوں کو جائے گا۔ بلوچستان کی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تو شاید صرف حبکو پاور کی پیداوار کافی ہو مگر کاغذات کے مطابق اب حبکو کول پاور کے تحت یہاں پیدا ہونے والی بجلی لاہور گرڈ منتقل ہو گی۔
- ہمیں نہیں معلوم کہ سی پیک سے ہمیں کیا ملے گا؟ اس میں کوئی شفافیت نہیں ہے۔ آیا ہم نے گوادر بیچ دیا ہے یا پھر تحفتاً دے دیا ہے۔ ہماری زمین غیر مقامی ہم سے چھین رہے ہیں اور ہمیں وہاں اقلیت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ بہترین ملازمتوں پر غیر مقامی افراد کو تعینات کیا جاتا ہے اور بلوچوں کے لیے معمولی ملازمتیں ہی رہ جاتی ہیں۔
- عصر حاضر میں طاقت کا توازن بدل رہا ہے۔ چین ایک نئے سامراج کے طور پر ابھر رہا ہے اور پرانی طاقتیں اسے محدود کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گی۔ یہ ایک موقع بھی ثابت ہو سکتا ہے مگر لگتا ہے کہ حسب سابق ہم ایک بار پھر اس گریٹ گیم کا شکار ہوں گے جہاں ہمیں معلوم بھی نہیں کہ ہم نے کن شرائط پر ان کو [چین] مدعو کیا ہے۔

- ان مصیبتوں کی ذمہ دار بلوچ قیادت خود ہے۔ ۶۵ اراکین صوبائی اسمبلی، ۱۱ اراکین قومی اسمبلی اور ۲۳ سینیٹرز، سب کا تعلق بلوچستان سے ہے۔ صوبائی بیوروکریسی میں بھی کافی تعداد مقامیوں کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بلوچوں کی طرف سے معاملات طے کرتے ہیں۔ یہ ان کی ناکامی ہے بلکہ استحصال اور اکثر کرپشن ہے جو کہ ہمارے لیے مسائل پر منتج ہوتی ہے۔

محمد اسلم بھوتانی

سابق سپیکر بلوچستان اسمبلی

بلوچستان پاکستان کا ایک اہم حصہ اور صوبہ ہے۔ اور تقریباً آدھا پاکستان ہے۔ پاکستان کے مجموعی زمینی رقبہ کا ۴۴ فیصد ہمارے پاس ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں اس کے وسائل، بالخصوص اس کی معدنیات اور ان کے ذخائر اس کی ترقی کا ضامن ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ عجیب اتفاق یہ ہوا ہے کہ ہماری مشکلات اور تکلیفیں، حتیٰ کہ ہمارے اوپر ہونے والی فوج کشیاں بھی ہمارے ان ہی ریسورسز کی وجہ سے ہوتی رہی ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر ہمارے پاس یہ وسائل نہ ہوتے، ساحل سمندر نہ ہوتا، سوئی سے گیس نہ نکلتی، ریکوڈک نہ ہوتا، یا واقعی ہماری جغرافیائی پوزیشن ایسی اہم نہیں ہوتی تو شاید ہمارا خطہ بہت ہی پرامن ہوتا۔

جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کے لیے میرے پاس دلائل ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب بلوچستان سے گیس نکلی تو اس وقت عام خیال یہ تھا اور کہا بھی جارہا تھا کہ بلوچستان میں اس کے ساتھ ترقی آئے گی۔ پورا بلوچستان بہت خوش تھا کہ ہمارے سہانے دن آنے والے ہیں لیکن وہ قدرتی گیس جو آج پورے پاکستان میں سوئی گیس کے نام سے پہچانی جاتی ہے چاہے وہ اب سندھ سے بھی نکلتی ہے لیکن اس کا نام سوئی نار درن اور سوئی سدرن ہی ہے، اسی سوئی کے نام سے وہ بنائی جاتی ہیں۔ کئی عشروں سے نکلنے والی بلوچستان کی اس گیس نے پورے پاکستان کو ترقی دی لیکن بلوچستان کے لوگ اسی بدحالی میں رہے۔

اس ناانصافی پر یہاں کی قیادت نے بات کرنے اور اپنا حق مانگنے کی کوشش کی تو بجائے حق دینے کے ان کو یہ کہا گیا کہ آپ ملک کے غدار ہیں، آپ ملک کے دشمن ہیں۔ آپ پاکستان کی ترقی نہیں چاہتے۔ حالانکہ یہ کسی نے نہیں کہا تھا کہ پاکستان کی ترقی نہیں چاہتے۔ بلکہ سب کا کہنا یہ تھا کہ بلوچستان کو اس کا حق دیا جائے۔ اس کے وسائل ہیں۔ ہماری بھی خواہش ہے کہ پورا ملک ترقی کرے لیکن ساتھ ہی ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے یہاں سے گیس یا کوئی اور ریسورسز نکلتے ہیں تو اس کا پہلا فائدہ ہمیں پہنچنا چاہیے۔ ہماری

> بلوچستان سے نکلنے والی گیس نے پورے ملک کو فائدہ پہنچایا اور ترقی دی لیکن بلوچستان کے لوگ محروم رہے۔ ہمارے یہاں سے کوئی resources نکلیں تو پہلا فائدہ ہمیں پہنچنا چاہیے۔

تگ و دو یہی رہی کہ حقوق کو غداری سے تعبیر نہ کیا جائے تاہم اس کے رد عمل میں جو آپریشنز ہوئے سب کے سامنے ہیں۔ اگر نواب اکبر بگٹی کی شہادت کو ہی لیا جائے تو اس کا تعلق بھی گیس اور اسی حوالہ سے حقوق بلوچستان سے ہے۔

اسی طرح پاور پراجیکٹس ہیں۔ مثلاً حبکو پاور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے بلوچستان میں بڑی سرمایہ کاری ہو گی۔ کول پاور کو تو نظر انداز کر دیں کہ وہ بہت الگ تنازعہ ہے لیکن اس وقت اُوچ، حبیب اللہ کوسٹل پاور اور موجودہ حبکو سے ۲۰۰۰ میگاواٹ سے زیادہ بجلی پیدا ہو رہی ہے۔ اب اگر یہ بجلی بلوچستان کو مل جائے تو ہمارے صوبے میں ایک منٹ کی بھی لوڈشیڈنگ نہ ہو۔ کیونکہ صوبہ کی مجموعی کھپت ۱۱/۱۲ سو میگاواٹ ہے۔ لیکن صورت یہ ہے کہ پراجیکٹ کا نام بلوچستان کا ہے اور ہمیں ان سے محض ۳ سے ۴ سو میگاواٹ بجلی مل رہی ہے۔ درحقیقت اگر ایک پاور ہاؤس کی پیداوار بھی کلی طور پر بلوچستان کے حوالے کر دی جائے تو ہمارے اندھیرے ختم ہو جائیں گے۔

حبکو کول پاور سے متعلق یہ ایک رپورٹ میرے سامنے ہے۔ رپورٹ کے مطابق سی پیک میں یہ سب سے بڑا انرجی پروجیکٹ ہے جو بلوچستان میں لگ رہا ہے۔ لیکن رپورٹ میں دی گئی اس پراجیکٹ کی تفصیل میں واضح طور پر تحریر ہے کہ "Power Evacuation from Gadani to National Grid Lahore" بریکٹ میں لکھا ہے (CPEC)۔ "Power Evacuation from Gadani to National Grid Faisalabad" بریکٹ میں ہے (CPEC)۔ اس کی تفصیلات میں کہیں بھی بلوچستان کا ذکر نہیں آیا کہ مثلاً Power Evacuation from Gadani to Khuzdar, Turbat, Panjgoor, Qillah Saifullah یا یہ معلوم ہو کہ بلوچستان کے کسی اور حصہ میں وہ گرڈ جائے گا۔

درحقیقت اگر ایک پاور ہاؤس کی پیداوار بھی کلی طور پر بلوچستان کے حوالے کر دی جائے تو ہمارے اندھیرے ختم ہو جائیں گے۔ لیکن پراجیکٹ کی تفصیل دیکھی جائے تو وہاں Power Evacuation from Gadani to National Grid Lahore تحریر ہوتا ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن پر یقیناً احتجاج ہو گا کہ نام ہمارا ہے، دھواں، تکلیفیں، بیماریاں یہ سب بھی بلوچستان کے کھاتے میں ہیں لیکن روشنی کہیں اور ہو رہی ہے۔ ہمیں اس سے بھی کوئی اختلاف نہیں کہ کہیں اور بھی روشنی ہو رہی ہے۔ ہمیں صرف اس پر اعتراض ہے کہ ہمارے گھر میں اندھیرا نہیں ہونا چاہیے اور اگر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں اندھیرا نہیں ہونا چاہیے تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم کسی اور کے خلاف ہیں۔

میں اسی حوالہ سے بلوچستان کے وسائل کو دیکھ رہا ہوں کہ یہ ہماری ترقی کے بجائے ہماری تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر گوادر اور اس کے ساتھ سمندر نہ ہوتا تو CPEC کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی نہ ہوتی۔

اللہ کرے کہ اب CPEC ہماری خوشحالی کا سبب بنے لیکن ہم جو کچھ ۶۰، ۷۰ سال سے دیکھتے چلے آرہے ہیں اس کی بناء پر تو مجھے بہت خوف اور ڈر لگتا ہے کہ یہ CPEC بھی کہیں ہماری اور زیادہ تباہی اور بربادی کا باعث نہ بن جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ سوئی گیس میں تو بین الاقوامی قوتوں کا اثر اور involvement نہیں تھی لیکن سی پیک میں چین کی موجودگی بین الاقوامی قوتوں اور ہمارے اڑوس پڑوس کے ممالک کو اپنی ترجیحات کے حوالے سے اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ چنانچہ مجھے ڈر اور خوف ہے کہ ہمارے ہاں محدود قسم کی جو عسکریت چل رہی ہے اس میں کہیں تیزی نہ آجائے اور بین الاقوامی طاقتیں اپنی سیاست اور اپنے مفادات کے لیے اس مزاحمت کی کھل کر حمایت نہ شروع کر دیں۔

اگرچہ سب ہی جانتے ہیں کہ CPEC ایک اکنامک پراجیکٹ ہے اور اکنامک سرگرمیاں وہاں ہوتی ہیں جہاں امن ہوتا ہے۔ تو شاید چین کی دلچسپی تو امن میں ہی ہوگی لیکن کیا چین کی مخالف قوتیں بھی اس امن کو برقرار رکھنا چاہیں گی؟ آپ دیکھیں کہ گوادر میں ایک دھماکہ ہوتا ہے تو وہاں کی زمینوں کی قیمتیں دھڑام سے گر کر نیچے آجاتی ہیں۔ اس طرح کی اگر مار ماری رہی تو CPEC کا اقتصادی پہلو تو از خود ہی پس منظر میں چلا جائے گا۔ کیونکہ سرمایہ کار وہاں جائے گا جہاں اس کو تحفظ ملے گا۔ جیسے ریکوڈک کی مثال لے لیں کہ اگر یہ منصوبہ ہم پر چھوڑ دیا جائے تو شاید ہم اسے دنیا کے سامنے بہتر انداز میں چلا سکیں۔ لیکن اس حوالہ سے بھی اسلام آباد سے کسی نہ کسی طرح کی مداخلت ہوتی رہی ہے۔ نتیجہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ بجائے ریکوڈک سے کچھ لینے کے اب شاید ہمیں اسے دینا پڑے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ کچھ عرصے میں International Court of Arbitration کا فیصلہ آنے والا ہے اور خدشہ یہی ہے کہ اس میں ہمیں اس سے لینے کے بجائے دینے پڑ رہے ہوں گے۔ پھر جب حکومت پاکستان پر معاہدے کی خلاف ورزی کی ذمہ داری آئے گی تو وہ بلوچستان کو ہی پاس آن کر دی جائے گی کہ دیکھیں آپ نے اس معاہدے پر سپریم کورٹ میں مخالفت کی بات کی تھی اس لیے یہ آپ بھگتیں۔ کوئی فائدہ ہوتا ہے تو کوئی اور مستفید ہوگا اور اگر جرمانہ آئے تو شاید ہمارے گلے میں پڑ جائے۔

اس پس منظر میں لگتا یہی ہے کہ ہماری معدنیات اور ہمارے وسائل ہی ہماری تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔ مجلس میں بہت سے شرکاء ہیں جو مجھ سے بہت زیادہ باخبر ہیں اور بہت تجربہ رکھتے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے موقع دیا کہ ان بڑی شخصیات اور بہت معتبر ناموں کے سامنے اپنی کچھ گزارشات پیش کر سکوں۔ بہت شکریہ

عبدالحکیم بلوچ

سابق چیف سیکرٹری

حکومتِ بلوچستان

اس وقت کوئی لمبی چوڑی تقریر پیشِ نظر نہیں ہے صرف دو چار باتیں عرض کروں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے دستور کے مطابق پاکستان ایک وفاقی ریاست ہے۔ فیڈرل اسٹیٹ میں آبادی سے قطع نظر تمام اکائیوں کی نمائندگی سینیٹ یا ایوان بالا میں برابر ہوتی ہے۔ اور پاور سینیٹ exercise کرتی ہے۔ چاہے یہ اختیار جنریشن آف ویلتھ کا ہو یا ڈسٹری بیوشن کا ہو یا ذرائع آمدنی کا ہو لیکن ہمارے یہاں عملاً ایسا نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پنجاب کا ذریعہ آمدنی بنیادی طور پر زراعت ہے جسے انہوں نے آئینی طور پر صوبائی عمل داری میں رکھ دیا ہے۔ جبکہ ہمارے وسائل، ہمارا ساحل، ہماری معدنیات بشمول کوئلے کی کانیں وغیرہ جو بلوچستان کے لیے ذریعہ آمدنی ہو سکتے تھے انہیں صوبائی کے بجائے وفاقی subject رکھا گیا۔ مثلاً سیندک سے چین کافی گولڈ نکال کر لے جا چکا ہے لیکن اس کا ہمیں کوئی اتا پتہ نہیں ہے، اور نہ ہی اس کا کوئی حصہ ہمیں مل رہا ہے۔ یہ طرز عمل بالکل غلط ہے۔ ہم نے اس کو کسی صورت میں نہ پہلے تسلیم کیا ہے اور نہ اب کریں گے۔ ہم چاہیں گے کہ اگر یہ فیڈریشن ہے تو ہر صوبے کی آمدنی کے جو بڑے ذرائع ہیں وہ اسی صوبہ کے حوالے کیے جائیں۔

معدنیات کے بارے میں بطور دلیل یہ کہتے ہیں کہ یہ زمین کے نیچے سے نکلتا ہے اس لیے فیڈرل کا یا مرکز کا ہے۔ اسی طرح سوئی گیس ہو یا کوئی دوسرے ذرائع ان کا سارا فائدہ فیڈریشن کے نام پر سنٹرل گورنمنٹ لے جاتی ہے جبکہ ہمارے بڑے ذرائع یہی ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ جو main wealth ہے یہ ہمیں دے دیں۔ لیکن اب تو جو زمین کے اوپر ہے اس پر بھی فیڈریشن کے نام پر مرکز نے دعویٰ کر دیا ہے۔ چنانچہ کے پی میں تمباکو کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیا، کے پی کو نہیں دیا۔ یہ جو زور زبردستی ہے فیڈریشن میں نہیں چلنی چاہیے۔ چنانچہ ہم صرف مرکز سے یا پنجاب سے، کیونکہ مرکز میں پنجاب ہی dominated ہے، اپنا یہ حق مانگتے ہیں کہ

> وفاق کے حوالہ سے سینیٹ ایک نمائندہ ادارہ ہے جہاں سب کی نمائندگی برابر ہونی چاہیے۔ لیکن اس وقت یہ ہے کہ اسلام آباد کی تین نشستوں کو ملا کر پنجاب کی عملاً ۲۵ اور فاٹا کو ملا کر کے پی کی عملاً ۳۰ نشستیں ہو جاتی ہیں۔

وہ ہمیں ایک مساوی شہری جیسے کہ پنجاب ہے اس کا حق دیں۔ ہمارے جو مساوی شہری حقوق ہیں ان کو انہوں نے چھینا ہے وہ ہمیں واپس دیے جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں سینیٹ میں پوری نمائندگی دی جائے۔ اب سینیٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تمام صوبوں کی نمائندگی برابر ہے لیکن برابر کیسے ہے؟ ۱۰۰ میں سے ہمارے حصے میں ۲۲ ہیں۔ آپ کے پی کا کیس لے لیں۔ جو ۸ سیٹیں فاٹا کو دی ہوئی ہیں انہیں ساتھ ملایا جائے تو پختونخوا کے عملاً ۳۰ ارکان بن جاتے ہیں۔ پنجاب کو لے لیں، اسلام آباد کی ۳ سیٹیں ملا کر ان کے ۲۵ ارکان بن جاتے ہیں۔ صرف سندھ اور بلوچستان کے ۲۲ ممبران ہیں۔ اسلام آباد capital territory ہے۔ امریکہ میں واشنگٹن capital territory ہے تو اس کی سینیٹ میں کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ ان کی نمائندگی کچھ میری لینڈ اور کچھ ورجینیا کے ساتھ ہے۔ اس طرح ہمیں سینیٹ میں برابر نمائندگی نہیں مل رہی۔

اب کہتے ہیں بل پہلے ایوان زیریں میں پیش ہوگا اور ایوان بالا کو اس میں کوئی بات کرنے یا ترمیم کرنے کا حق یا ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح تو یہ ایوان بالا نہیں ایک مذاق ہو گیا۔ فیڈریشن میں تو ایوان بالا ہی اہم تر ہوتا ہے جبکہ وہاں ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں ہو رہا ہے، وہاں بھی ایک صوبے کی بالادستی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ایسٹ بنگال یا مشرقی پاکستان بن گیا تو اس وقت تو آپ parity کے فارمولے کو تسلیم کرتے تھے یعنی یہ کہ ۵۰ فیصد تو تم لے لو اور ۵۰ فیصد ہم لیں گے۔ اس وقت بھی یہاں پر پنجاب کا ۴۰ فیصد حصہ تھا۔ باقی تین صوبوں کو ۲۰ فیصد بھی نہیں ملا کرتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہ بھی rightoff کر دیا۔ اب جب ہم بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جی آپ کا تو ۵ فیصد آئین میں ہے۔ جب بنگال کی بات تھی تو parity تھی اور اب جب بنگال چلا گیا تو اب آبادی کے فارمولے کی بات کر رہے ہیں۔

> پاکستان ایک وفاق 'Federation' ہے۔ ہر صوبے میں موجود معدنی وسائل پر وہاں کے لوگوں کا ہی مکمل حق ہونا چاہیے۔ پنجاب کی آمدن کا اہم ذریعہ زراعت ہے جو کہ صوبے کے حوالے کر دیا گیا۔ جبکہ بلوچستان کا بڑا ذریعہ آمدن اس کے معدنی وسائل اور سمندر ہیں تو اس طرح بلوچستان کو بھی اس کے معدنی وسائل کی آمدن پر اختیار ہونا چاہیے۔

فیڈریشن میں کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے۔ وہاں پر برابر کی سطح پر distribution ہوتی ہے۔ مثلاً امریکہ میں ایک ریاست Wyoming ہے اس کا ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو میں ایک نمائندہ ہے۔ جبکہ سینیٹ میں اس کے دو نمائندے ہیں۔ اس طرح آپ جب تک سینیٹ کو پاور فل / بااختیار نہیں بنائیں گے جس طرح کہ امریکہ میں ہے اور چاروں صوبائی اکائیوں کو برابر کی نمائندگی نہیں دیں گے تو توازن قائم نہیں ہوگا۔ اور اس وقت تک ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق نہیں ملا ہے۔ بہت شکریہ

امان اللہ کنرانی
ایڈووکیٹ
سابق سینیٹر، ایڈووکیٹ جنرل
حکومتِ بلوچستان

معدنی وسائل کے حوالے سے میرا تھوڑا بہت تعلق رہا ہے اور دوسری جانب سیاسی و قانونی دائرہ میں بھی سرگرم رہا ہوں۔ اس حوالہ سے تاریخی پس منظر کے طور پر اور آپ کی دلچسپی کے لیے دو مثالوں کی بنیاد پر صورت حال کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہم اپنے حقیقی مسائل کو سمجھ سکیں۔

پہلی مثال بلوچستان سے گیس کی دریافت کی ہے کہ یہ کس طرح کی گئی اور آج بلوچستان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں جو بات کر رہا ہوں وہ نواب اکبر خان بگٹی نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر بیان کی۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۳۰ سے ۱۹۴۰ کے درمیان بلوچستان کا AGG (Agent to the Governor General) ان کے والد کے پاس دو دن ٹھہرا۔ یہ کوئی سرکاری دورہ نہیں تھا اس نے خیر سگالی کی بنا پر کہا کہ میں آپ کا مہمان بننا چاہتا ہوں۔ دو دن کے لیے وہ یہاں ٹھہرا اور اس وقت کے سکے کے مطابق مہمان خانے کے خرچ کے لیے اس نے تقریباً ۳ لاکھ کی رقم بطور تحفہ دی۔ اس وقت یہ رواج تھا کہ کسی سردار، نواب یا قبائلی معتبر کے پاس لوگ جاتے تو مہمان خانے کے خرچ کے لیے اپنی بھیڑ بکریاں لے جاتے یا کسی اور حوالے سے کچھ تحفتاً پیش کرتے تھے۔ AGG چونکہ انگریز تھا اور اس اعتبار سے اس کا اس رسم و رواج سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ یہاں کا رسم و رواج ہے اس نے اس کا اہتمام کیا۔ نواب صاحب کے بقول آگے بھی وہ جن جن سردار یا نواب کی طرف گیا اس نے اس طرح ہی تحفے کے طور پر رقم دینے کا اہتمام کیا۔ نواب صاحب کے خیال میں اس کا یہ اہتمام صرف goodwill کے طور پر تھا۔ وہ یہ حصہ اس لیے دینا چاہتا تھا تاکہ علاقے کے لوگوں سے کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ گیس تو ۱۹۵۲ میں دریافت ہوئی لیکن انگریز AGG نے جب یہ کام کیا تو یہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کا دور تھا۔ درحقیقت یہ برٹش پٹرولیم کے لیے ایک بنیاد تھی جو اس وقت سے ڈال دی گئی۔ اس کے بدلے انہوں نے لیویز کا نظام دیا کہ یہ جو مقامی حکومت ہے یہ آپ کے حوالے ہے۔ گورنمنٹ کی صرف ایک سرویلنس یا نگرانی ہوگی، باقی جرگہ سسٹم ہوگا۔

آج ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ قبائلی سسٹم روایتی انداز میں قائم رہے، میں یہ مثال دے کر اس کی پروموشن کی بات نہیں کر رہا۔ میرے خیال میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کو ایک اختیار دینے کا تصور دیا۔ انگریز نے بے شک جبر بھی کیا ہوگا، اسی لیے ہم نے اس سے آزادی بھی حاصل کی اور آج ہم یقیناً بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں۔ وسائل پر اس وقت ان کا قبضہ

تھا، سیاسی طور پر خود مختاری بھی نہیں تھی مگر ایک سکول آف تھاٹ کی حیثیت سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ انہوں نے لوگوں کے اندر اپنی حاکمیت کا ایک مثبت تصور دیا ہے۔ اور اسی لیے ان کے خلاف کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔

PPL والے خود وسائل نکال کر لے گئے، کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں بس بھائی بندی کی بنیاد پر تعاون بن گیا۔ نواب صاحب نے یہ بھی بتایا کہ انگریز افسر بالعموم اپنی بیگم کے ساتھ تشریف لاتے تھے۔ غمی کے موقع پر اور شادی میں ہماری طرح پگڑی پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر آتے تھے اور مقامی لوگوں میں اپنے آپ کو اس طرح شمار کرتے تھے کہ ہم آپ میں سے ہیں۔ نواب بگٹی کہتے ہیں کہ اس کے برعکس میں ایوب خان کے دور میں جیل میں تھا تو جیل سے باہر آنے کے بعد بڑی مشکل سے حکومت سے ہم نے جو بات چیت کی تو معاملات نوکری کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔

نواب صاحب کا آخری جوٹر مائل ہوا، اس کا پس منظر بھی قابل ذکر ہے۔ نواب بگٹی نے ۱۰۲ نوکریوں کا کہا۔ جس کا میں (امان اللہ کنرانی) ذاتی طور پر گواہ ہوں اور ہم لوگوں نے باقاعدہ لسٹ دی کیونکہ یونین والوں کا ایشو یہ تھا کہ گیس کے ہر کنویں پر ایک چوکیدار ہوتا تھا۔ نواب بگٹی نے کہا کہ اب لیبر لاز آ گئے ہیں، awareness آ گئی ہے، حالات خراب ہو گئے ہیں اور لوگوں کی ضرورتیں بڑھ گئی ہیں۔ اب ایک آدمی چوبیس گھنٹے ڈیوٹی نہیں کر سکتا۔ دوسری جانب اب سیکوریٹی کے مسائل بڑھ گئے ہیں۔ لوگ اب بم پھاڑتے ہیں، جس سے غیر معمولی تباہی ہوتی ہے۔ اس کو روکنے کے لیے ہر کنویں پر ۳ بندے لگائیں۔ تین بندوں سے مراد ۸ گھنٹے ڈیوٹی کے لیے ایک فرد جو سرکاری لیبر لاز کی شرائط کا حصہ ہے۔ بنیادی طور پر اس مطالبہ پر اختلاف تھا کہ اگر تین بندے رکھتے ہیں تو اس کے بدلے میں ان کو (۱۰۲) اضافی نوکریاں دینی پڑتیں۔ یہ نوکریاں نہیں ملیں اور اس کے بعد پھر ڈاکٹر شازیہ والا کیس ہو گیا جس نے تنازعہ کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا رہا وہ آپ کے سامنے ہے۔

انگریزوں کے اس برادرانہ طرزِ عمل کے مقابلہ میں آج یہ تصور ہے کہ ہم نے زبردستی سب کچھ کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ لاء اینڈ آرڈر پر خرچ کر رہے ہیں اور ایف سی، پولیس یا لیویز کی طاقت کے ذریعے کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چار گیس فیلڈز ہیں۔ اوچ، لوٹی، پیر کوہ، اور سوئی۔ جتنا سوئی نرمی سے ہینڈل ہوا، بقیہ ہینڈل نہیں ہو سکے۔ آج بھی کبھی گیس لائن پھٹ جاتی ہے یا اور کوئی 'حادثات' ہو جاتے ہیں۔ یہی حال مری کے علاقے کا ہے کہ آج تک وہاں عملاً کوئی رسائی ہی نہیں مل سکی اور یوں وہاں کوئی معدنی دریافت بھی نہیں ہوئی۔

ظاہر ہے کہ اب ہمیں مرنے کا شوق نہیں ہے۔ جیسے کہ بھوتانی صاحب نے کہا کہ نواب بگٹی کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے وہ ہم اپنے ساتھ نہیں دیکھنا چاہتے۔ بے شک معدنی وسائل زمین کے نیچے پڑے رہیں امن وامان اور سلامتی تو باقی رہے۔ کیونکہ جب ریسورسز آتے ہیں اور لوگوں کا انٹرسٹ بڑھتا ہے تو پھر لوگوں کو لڑایا اور مروایا جاتا ہے۔ ہم مرنا نہیں چاہتے۔ آخر تک بھی خیر بخش مری نے اپنے علاقے میں رسمی اجازت دی یا نہیں دی لیکن انہوں نے کسی شوق اور گرمجوشی کا اظہار بھی نہیں کیا۔

نواب بگٹی آخر تک یہ کہتے تھا کہ یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم لوگوں نے معاہدات کیے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کم از کم زندہ تو ہوتے۔ ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ بگٹی قبائل میں بھی آپس کی دشمنیاں ہو گئیں۔ درحقیقت مری علاقے میں اتنی قبائلی دشمنی نہیں ہے جتنی کہ بگٹی علاقے میں ہے۔ سرکار کے ہاتھوں بھی مری کے اتنے لوگ نہیں مرے، کیونکہ مری نے ایک سسٹم کے تحت اپنے آپ کو چلایا، مری نے کبھی ان ایشوز کو زیادہ highlight نہیں کیا۔ انہوں نے آرام سے اور خاموشی کے ساتھ کام کیا۔ لیکن بگٹی اور اس کی فیملی نے آج سے پہلے ہر چیز اور اپنے آپ کو ریاست کے حوالے کیا۔ لیکن پھر ریاست نے جو سلوک کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ میں اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا لیکن آپ اگر موازنہ کریں تو ریاست نے مری کو کم جانی نقصان پہنچایا اور بگٹی کو زیادہ۔ بگٹی نے وسائل زیادہ دیے اور نقصان زیادہ اٹھایا۔ دوسری مثال غیر ملکی کمپنیوں کے ساتھ معاہدات کی ہے۔ سیندک کے حوالہ سے آج بھی حکومت بلوچستان نالاں ہے کہ ہمارے ساتھ چین جو کچھ کر رہا ہے ہم اس کو روک نہیں پا رہے۔ اس کی وجہ ہے کہ سیندک کا ایگریمنٹ مرکز نے کیا ہوا ہے اور آج بھی مرکز ہی اس کو فالو کر رہا ہے۔ بنیادی فیصلے اسی کے اختیار میں ہیں۔ بلوچستان کی حکومت نے صرف افتتاحی تقریب منعقد کر دی ہے لیکن کچھ پتہ نہیں کہ حکومت بلوچستان کو کتنا کچھ ملا ہے۔

یہی حال ریکوڈک کا ہے، اس کے بارے میں جتنی تحقیق کریں کم ہے۔ دستاویزات کے مطابق اس کی تین سو سال لائف ہے۔ اور ۶۰۰ مربع کلو میٹر اس کی لمبائی ہے۔ اس کے اندر تانبا اور سونا ہی نہیں جو نسبتاً کم تناسب میں ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتی مواد بشمول ایٹمی ضروریات میں استعمال ہونے والا مواد موجود ہے۔ ماہرین کے بقول مختلف قسم کی معدنیات ہیں جس کی کل قیمت کا دنیا کی مارکیٹ میں اندازہ ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر مختلف لوگوں کی دلچسپی بہت زیادہ ہے۔ سب سے پہلے امریکہ کا پولیٹیکل انٹرسٹ ہے، برطانیہ کی انوسٹمنٹ ہے، کینیڈا کی کمپنیاں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ چلی کے ماہرین بھی ہیں۔

آسٹریلیا کو انہوں نے ایک پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ پاکستان اور آسٹریلیا کا ۱۹۹۷ میں نواز شریف گورنمنٹ کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا۔ معاہدہ یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کے انوسٹمنٹ کو تحفظ دیں گے۔ اس معاہدہ کو سامنے رکھ کر انہوں نے چالاکی یہ کی کہ رجسٹریشن آسٹریلیا جا کر کرائی۔ یعنی پیسہ لے رہے ہیں برطانوی بینک سے، پولیٹیکلی امریکہ بیک کر رہا ہے، کمپنی کا وجود کینیڈا میں اور ماہرین اور انجینئرز چلی کے ہیں، جبکہ رجسٹریشن آسٹریلیا میں جا کر کراتے ہیں تاکہ اس ٹریٹی کا فائدہ اٹھا سکیں۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آپ حکومت سے لائسنس لیتے ہیں کہ اگر کچھ دریافت ہوا تو ہم آپ کو بتائیں گے، اتنا آپ کو ٹیکس ملے گا اور آپ کی جو قانونی شرائط ہیں ہم وہ بھی پوری کریں گے اور اگر کچھ نہیں ملا تو یہ ہمارا اپنا نقصان ہے۔ اس میں لینے دینے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ انہوں نے بھی اسی طرح ۱۹۹۳ میں لائسنس لیے۔ BDA کے ساتھ ایگریمنٹ ہوا۔ ۱۹۹۴ میں ان کو ۱۳۰۰۰ مربع کلو میٹر کے لیے ۱۹۷۰ کے رولز کے تحت ۱۰ لائسنس ملے۔ فضائی اور زمینی سروے کرتے ہوئے آہستہ آہستہ وہ اس مجموعی رقبہ سے withdraw کرتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۹ تک انہوں نے اس کو narrow down کر کے ۱۰۰۰ مربع کلو میٹر تک محدود کرا دیا۔

قانون یہ تھا کہ کمپنی نے ہر دو سال میں ہمیں ایک رپورٹ دینی ہے کہ ان کی پراگریس (progress) کیا ہے؟ ۲۰ جنوری ۱۹۹۴ کو جو پہلا PL (Prospective Liscense) جاری ہوا، اس وقت اس کمپنی کا نام BHP تھا۔ تو BHP کمپنی کو چاہیے تھا کہ ۱۹۹۶ یعنی پہلے دو سال میں رپورٹ دیتی۔ اس نے رپورٹ ہی نہیں دی۔ رپورٹ نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ اتنا چھوڑو، بعد میں رپورٹ دیں گے۔ لیکن وہ ۲۰۰۰ تک ایکسٹنشن لیتے رہے رپورٹ کوئی نہ دی اور دوسری جانب ایریا withdraw کرتے رہے۔ ۲۰۰۰ کے بعد اس نے اپنی کمپنی کا نام BHP سے تبدیل کر کے چلی کی ایک کمپنی مینکور (Mincor) کو دے دیا۔ رپورٹ طلب کیے جانے پر اب ان کا جواب ملا کہ ہم نے تو اب مینکور کو دے دیا ہے، وہ جانیں اور آپ جانیں۔ اب اس وقت کے ہمارے جو آفیشلز تھے یا تو ان کو پتہ نہیں تھا یا سادگی تھی اور یا connivance تھا۔ بعدازاں سارا انٹرسٹ مینکور کو دے دیا گیا۔ BHP سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی کہ تم تو ڈیفالٹر ہو گئے ہو۔ پاکستانی قوانین کے مطابق اصولاً تین بار لائسنس دیا جا سکتا ہے پھر وہ کمپنی ڈیفالٹر بن جائے گی۔ جس کے بعد اسے نکالا جا سکتا ہے۔ BHP نے نکلنے سے بچنے کی خاطر اپنے آپ کو سرنڈر کر دیا کہ اب ہم ختم ہیں ہم سے پوچھا نہ جائے تاکہ یہ ایریا بھی ہمارے قبضے میں رہے اور ہم ڈیفالٹرز بھی نہ ہوں۔

> انگریز نوابوں، سرداروں اور مقامی قیادت کو تحفتاً رقم بھی دیتے تھے اور اپنے علاقہ میں انہیں اختیارات بھی دیتے تھے کہ گورنمنٹ کی صرف نگرانی ہو گی۔ اس زمانے میں برٹش پٹرولیم والے آئے اور یہاں سے پٹرول بھی لے گئے کوئی معاہدہ کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یہاں وہ ہماری ثقافت کو چیلنج نہ کرتے تھے۔

مینکور (Mincor) نے ۲۰۰۰ء میں جا کر آسٹریلیا میں TTC بنائی، یعنی اب وہ ٹیتھیان کاپر کمپنی بن گئی۔ ٹیتھیان کاپر کمپنی نے آتے ہی یہ کیا کہ سب سے پہلے تو اس وقت چونکہ عملاً مارشل لاء تھا اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۷۰ کے رولز کا اطلاق ختم کرایا۔ کیونکہ اس کے تحت تو یہ ۶ سال میں ڈیفالٹر ہو چکے تھے۔ نئے رولز کے لیے انہوں نے یہ فیصلہ کرا لیا کہ ایک این جی او کمپنی ہو اور اس وقت کے سیکرٹری (یا ڈی جی مائنز) کو کہا گیا کہ آپ ان کی کمپنی کے ساتھ بیٹھیں اور ان کی مرضی سے رولز بنائیں۔ یعنی کمپنی کے اپنی مرضی کے رولز بنائے گئے جبکہ پیسے بھی حکومت پاکستان نے دیے۔ یوں رولز ان کی مرضی کے بنائے گئے جن میں انہوں نے ۲ سال کی کنڈیشن کو ختم کر کے ۳ سال کرا لیا۔ نیز یہ طے کر دیا گیا کہ اب یہ پرسپکٹو لائسنس (PL) نہیں ہو گی بلکہ EL یعنی ایکسپلوریشن لائسنس ہو گا، مدت تین سال ہو گی۔ تین ٹرم کے بعد وہ فزیبلٹی دیں گے تو تقریباً ۹ سال کا یہ عرصہ ہو جائے گا۔ ایریا کے بارے میں بھی یہ طے تھا کہ کسی کو بھی ۱۰۰ ایکڑ سے زیادہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس ایریا کو انہوں نے لامحدود کرا دیا یعنی جس کو جتنا مرضی ہے دے دیا جائے تاکہ ۳۰۰۰ کلومیٹر کا ایشو ہی ختم ہو جائے۔ پھر اس کا ریٹ اس وقت مائنز ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ۵ روپے ایکڑ تھا۔ ۳۳ لاکھ ایکڑ اس وقت تھے۔ وہ بھی حکومت نے بجائے اس کے ان سے لیں انہیں اس طرح معاف کر دیا کہ ۵ روپے کو پہلے ایک روپیہ کیا اور پھر ایک روپے کو بھی waive-off کر دیا۔ آگے چل کر پھر یہ بھی طے کرایا کہ آپ

کا اور ہمارا تنازعہ ہوگا تو بین الاقوامی طور پر طے ہوگا ہماری کورٹ طے نہیں کرے گی۔ پیسوں کا کوئی ایشو نہیں ہوگا، جگہ کا کوئی ایریا ایشو نہیں ہوگا مطلب یہ کہ پاکستانی قانون کو ہمارے سامنے معطل کر دو۔ یعنی قانون خود بنایا اور پھر یہ relaxation بھی مانگتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ادارے اور ہماری حکومتیں سب کچھ ان کے آگے سرنڈر کرتے رہے ہیں۔

اس دوران میں سابق رکن قومی اسمبلی مولانا عبدالحق بلوچ صاحب اور احسان اللہ وقاص، دونوں جماعت اسلامی کے لوگ تھے، نے اس پورے معاملہ کو بلوچستان ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ پٹیشن یہ تھی کہ یہ کمپنیاں بہت سی سہولتیں لے رہی ہیں اور کوئی فیس اور ٹیکس بھی نہیں دے رہیں۔ دوسری جانب قانون کے مطابق ان کو جو کچھ دریافت کرنا چاہیے اس میں بھی پیش رفت نہیں ہے۔ اگر کنٹریکٹ کسی اور کو دے دیا جائے تو امکان ہے کہ پیش رفت ہوگی اور کچھ نہ کچھ فیس تو ملے گی۔ اس تناظر میں مطالبہ یہ کیا گیا کہ معاہدہ بدنیتی پر مبنی ہے اور اس کو ختم کیا جائے۔ تاہم بلوچستان ہائی کورٹ نے پٹیشن مسترد کر دی۔ حکومت نے بھی کہا کہ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔ یوں نہ ہائی کورٹ نے مداخلت کی اور نہ ہی حکومتِ وقت نے مخالفت کی۔

> اس کے مقابلہ میں اب تصور یہ ہے کہ ہم نے زبردستی اور طاقت کے بل پر اپنے آپ کو منوانا ہے۔ طاقت کے مقابلہ میں مزاحمت تو ہوگی۔ چار گیس فیلڈز ۔۔ اوچ، پیر کوہ، لوٹی اور سوئی ہیں۔ سوئی کا جو حشر ہوا ہے (اور نواب بگٹی تک کی شہادت ہوگئی) اس کے بعد ہم یہی سوچتے ہیں کہ بے شک وسائل زمین کے نیچے ہی پڑے رہیں۔ انہیں نکالنے کا کیا فائدہ ہوگا اس سے تو فسادات ہوں گے۔

مولانا عبدالحق بلوچ ۲۰۰۷ میں سپریم کورٹ چلے گئے جہاں معاملہ ۲۰۱۰ تک التواء میں ہی رہا۔ کسی نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کیونکہ چوہدری افتخار صاحب بھی اس سے پہلے پی سی او کے جج تھے۔ تاہم جب معاملہ میڈیا میں زیر بحث آنے لگا اور دوسری جانب اعظم سواتی صاحب نے ۲۵ سینیٹرز کے ساتھ طارق اسد ایڈووکیٹ اور پھر ظفر اللہ خان کے ذریعے ایک درخواست دی تو کافی لوگ اس جانب متوجہ ہوگئے۔ اس وقت کے چیف جسٹس چوہدری افتخار نے مسئلہ کو سنا اور اس وقت کی بلوچستان حکومت نے خصوصاً نواب اسلم رئیسانی صاحب کے دور حکومت میں اس میں خصوصی دلچسپی لی گئی۔ درحقیقت نواب رئیسانی صاحب پر اثرانداز ہونے کے لیے ان کمپنیوں نے کروڑوں نہیں اربوں روپے کی آفر کی کہ ہماری اس کیس میں مدد کریں۔ لیکن نواب رئیسانی نے ایسی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ یہ کریڈٹ انہیں دیا جانا چاہیے۔ وجہ کوئی بھی ہو لیکن خوش قسمتی سے ہمارے قومی سلامتی کے ادارے بھی اس معاملہ میں ہم آہنگ تھے۔ اس طرح حکومت کے تمام اہم عناصر ایک پیج پر آگئے اور یوں ہم ان کمپنیوں کے چنگل سے بچ گئے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے ۷ جنوری ۲۰۱۳ کو پٹیشن کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

ہمیں اس وقت بھی امید نہیں تھی کہ بین الاقوامی اداروں میں ہمارے حق میں کوئی فیصلہ ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں عدل وانصاف اور انسانی حقوق کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن ان پر عمل درآمد اس وقت تک نہیں کیا جاتا جب تک اس میں بڑی طاقتوں کا مفاد نہ ہو۔ یوں ہمیں

کوئی توقع نہیں تھی کہ بین الاقوامی اداروں سے ہمیں انصاف ملے گا۔ درحقیقت ایسے حوالوں سے بننے والے ٹریبونل اکثر ان ساہوکاروں کے اپنے ہوتے ہیں اور ان کو ادائیگیاں بھی یہی ساہوکار کمپنیاں کرتی ہیں۔ جب ان کا روزگار ان کمپنیوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور یہی کمپنیاں ان کی نامزدگی کرتی ہیں۔ انہوں نے فیصلہ بھی پھر انہی کے حق میں کرنا ہوتا ہے۔

اس کے باوجود بین الاقوامی ٹریبونل کا جو فیصلہ آیا ہے وہ کوئی جرمانہ بھی نہیں اور compensation بھی نہیں ہے۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم نے جتنا کام کیا ہے وہ ہمیں پیسے دے دیں۔ تاہم دوسری جانب ٹریبونل کہتا ہے کہ آپ نے آسٹریلیا والے ٹریٹی کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ آپ نے انوسٹمنٹ کو پروٹیکٹ نہیں کیا ہے لہٰذا آپ ان کے ساتھ اس میں بیٹھیں۔ یہ نہیں کہا کہ پیسے دیں بلکہ بیٹھ کر طے کریں کہ کتنا نقصان ہوا ہے۔ اب یہ ہے کہ مائننگ کے ایکسپرٹس بیٹھے ہوئے ہیں وہ موقع پر دیکھیں گے ایک دوسرے کے ساتھ دستاویزات شیئر کریں گے اور جتنا خرچ اصل ہوا ہے اگر یہ لوگ آپس میں مان گئے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ معاملہ پھر دوبارہ ٹریبونل میں جائے گا۔ یوں ابھی تنازعہ باقی ہے۔ ابھی تک صرف تنازعہ کی حد تک ان کے موقف کو تسلیم کیا گیا ہے۔

اگلی بات یہ ہے کہ اب آئندہ بھی اگر تنازعہ حل نہ ہوا تو بیرونی دنیا کے ساتھ معاہدہ کے حوالہ سے ہمارا ۲۰۱۱ کا ایک قانون ہے کہ ان کی ڈکری (Decree) کس طرح پاکستان میں execute ہوتی ہے۔ ۲۰۱۱ کے قانون کے مطابق فارن ایوارڈ کا ایگزی کیوشن ہائی کورٹ کے تصفیے سے مشروط ہے۔ یوں جب انہوں نے پیسہ لینا ہوا تو وہ بلوچستان ہائی کورٹ میں اپیل کریں گے۔ فطری طور پر جب کیس بلوچستان ہائی کورٹ میں آئے گا تو ان کے سامنے اپنی سپریم کورٹ کا فیصلہ ہوگا جس میں کمپنیوں کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ واضح طور پر ہمارے حق میں ہے۔ اس صورت میں ہم سمجھتے ہیں کہ حال ہی میں آنے والے ٹریبونل کے فیصلے پر کوئی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔

اصل پریشانی کچھ اور ہے۔ بلوچستان بہت بڑی معدنی دولت ہے۔ یہاں بہت زیادہ امکانات ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اندر اس وقت ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کی استعداد نہیں ہے۔ نواب بگٹی اور نواب مری بھی یہی کہتے تھے کہ ہمارے اندر ابھی تک معدنی وسائل کو نکالنے کا استعداد نہیں ہے جس کے لیے ہم جلدی کریں۔ اس لیے جو کچھ بھی کرنا ہو اس کے لیے لوگوں کے اعتماد کے ساتھ اور ان کے تحفظات کو دور کرتے ہوئے مل جل کر کام کرنے کی حکمت عملی بنانا ہوگی۔ دنیا میں مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی لڑائی کے بعد بھی اکٹھے ہوگئے، امریکہ کے ساتھ طویل اور مسلسل جاری لڑائی کے باوجود طالبان کا ہیڈ کوارٹر قطر میں بھی بن سکتا ہے تو ہم پاکستانی تو جو کچھ بھی ہیں، بھائی ہیں مسلمان ہیں۔ ہم باہم مل کر فیصلے کیوں نہیں کر سکتے۔

حکیم بلوچ صاحب زیادہ بہتر بتائیں گے کہ دوسرے بہت سے علاقوں کے مقابلہ میں پاکستان اور بلوچستان کے اشتراک کا معاملہ ذرا الگ ہے۔ باقی جگہوں پر تو کہیں ریفرنڈم بھی کرانے کی ضرورت پیش آئی لیکن بلوچستان کے لوگوں نے اپنی سرزمین پاکستان کو دی کہ ہم پاکستان بنا رہے ہیں۔ بلوچستان کی صورتحال اس اعتبار سے باقی پاکستان سے مختلف ہے۔ یہی میری گزارش ہے۔ شکریہ

منیر احمد بادینی
سابق سیکرٹری
حکومتِ بلوچستان

I would like to start by quoting some great thinkers who rendered "geography is destiny". What they meant by this was that the birth at a certain place, in a certain time is not determined by the individual but by the forces of nature. So, for us, Baloch people, this land Balochistan is our destiny as we have inhabited this place since centuries and we love it. Long ago, one of the nationalist poets of Balochistan, wrote about the minerals of Balochistan in one of his great poems. I don't want to narrate that couplet but it categorically asked to whom these minerals, gases and gold belong to? These belong to me. So, we think that being destined and blessed to be born on this piece of land which is called Balochistan, everything being found here belongs to us. And that sense of belonging is something which is distinct, a distinct cultural trait of Baloch people. They love their land, they love their language, and they love their environment. They have some sort of inherent feelings about their nationality. Sometimes when we talk about Balochistan with the people of other provinces of Pakistan, they get surprised and comment that we describe or express Baloch as a religious feeling. So, this religiosity is also attached with Balochistan and is being carried from generation to generation as a conferred and emotional attachment.

I don't want to dilate much upon this subject but as my respectable colleagues have talked in the context of the minerals of Balochistan, I feel it imperative to highlight a few things even though I might not be able to talk in quantifiable terms.

No. 1 Considering that geography is destiny, I think the policymakers of Balochistan or Pakistan, whenever they want to coin a policy or whenever they want to figure out something about Balochistan, they must take into consideration that these people of Pakistan have got a special love for their land. And this feeling of belonging cannot be separated from their hearts.

My second point is that to me, today's Pakistan is a modern nation state by all means and nobody can deny this fact. But this modern nation state is also a blend (immingling) and is trying to find its legitimacy as all other modern nation states that are facing the problem of ethnicity. The problem of ethnicity and the nationalistic feeling among their units is a bare fact. Pakistani policymakers, in one way or other have to take into consideration this fact that this is a multinational state. So, if Pakistan wants to be a modern nation state in the real sense of the word, has to take into consideration its four or five parts, one we have lost, the bigger part is lost unfortunately and that was Bengal. I was a college student when Bangladesh came into being and today when I read or write about the incident, my heart aches. I don't intend to praise myself but I have written hundred novels and a few of them depict this ethos of Pakistan. How East Pakistan was being disintegrated? How the majority part of Pakistan got separated from the minority when otherwise there are minorities who separate themselves from a majority. In case of Bangladesh it was the other way around and that is a tragic point. At least I can say that we can live in Pakistan but we want our rights being protected within the constitutional limits of this country and it is our birth right that we must fight for our rights. So, for us the important things are that 1. We said geography is destiny and 2. Pakistan nation state must realize its responsibility.

My third point is that culture is a determining factor. Now what is culture? You know that the separation of Bangladesh was not based on the distribution of cotton, it was the language. Bengali nationalism arose on the issue of language when you said that from now on Urdu shall be the national language of Pakistan. So, for me

the way I mutualize this core issue of Balochistan and Pakistan is that our language is important. We want to express ourselves and every Punjabi, Sindhi, Baloch and Pushtun want to express themselves effectively. Mother tongues must be taught at the primary level. We have fought for it and we have run certain studies in the area as well that were funded by the UNICEF and the UNESCO. And from the results of those studies, it was revealed that when you are fluent in your mother tongue the learning of a foreign language becomes easy for you. Urdu is a foreign language for me as a Baloch but if I am fluent in Balochi, I could learn Urdu, French or German easily. So, as secretary education we fought for this that we should make mother tongue part of our curriculum. And then comes our literature, our customs and traditions. Yes, we do possess certain bad cultural traits and customs and we want to modernize ourselves according to the requirements of 21st century. We want to see Baloch in pace with the 21st century and for that we will have to do away with certain old customs and traditions to benefit from the light of the modern education and technology.

Change is my next topic. Change from within and change from outside. Whatever we are feeling in present, the change is coming not from within but it's coming from outside elements. How can you cope with change, if that change is not coming from your own heart? I talked about this before with the President of Pakistan as well and told him that the youth of Balochistan is very important. Till now, it has been ignored but they must get due importance as they form the bulk of the population. They want change, they want the benefits of the modern technology, they want to be the part of CPEC, and they want to be the part of the rest of the developments going on. If you could involve them in the real sense, only then you can do away with this sense of alienation that prevails amongst the youth of Balochistan.

For the brevity I move on to the next point - Development of infrastructure or evolution of ideas? I don't know - I might be wrong but I always think that nations are made not by the roads or by the infrastructure but they are made by the

constructive ideas. This country is a product of an idea but now what is the idea governing this country? What is the idea that could synthesize Pakistan into ONE? What is Pakistaniyat? Where is Pakistan? Who is sacrificing for Pakistan? We are fighting for our own vested self-interests. Basically, the leadership of Pakistan in the beginning were very wise and selfless people. The early leadership of Muslim League did not possess any material assets like cars and bungalows but they were an educated lot being groomed by oxford and Harvard. But today you can very well see the state of affairs and can relate to all the political animals we live with. It's the race of money, race of power and selfish gains.

To me the ideology is important, I mean loving the ideas. We are ideology-based people. We idealize everything and love our ideas; we love the symbols, what is the symbol of Pakistan? So, try to promote the symbol of Pakistan in the real sense of the word. Don't mix it up with the religion. Religion is one factor to bind it together. Apart from religion there are many other important factors that are being ignored and need to be taken into account. Saying that we are Muslims does not account for that we are Pakistanis. This is the very limited definition of Pakistani nationalism and I think we must transcend this.

Now I come towards my next point "federalism". Yes, 1973 constitution reflects the federalism of this country. We have four units. Implement the 1973 constitution in the letter and spirit. This is the legitimate constitution. We believe in the constitution. If it is implemented, I believe the rights of the Baloch people will be served within the constitutional limits of Pakistan. As a pro-Pakistani and a constitutionalist, I believe in that.

We are living in very uneasy peace. Something is lagging behind, we are living in a constant state of fears. And then there is impression. As a student of psychology, I have studied human aggression as a product of fears and if it goes to extremes, it becomes paranoid. A paranoid person cheers just for the sake of his own security. He attracts, he kicks this aggression. Today we are facing this aggression amongst

the youth of Balochistan and this aggression is expanding. This is when you do not find ways and means to satisfy yourself and be happy. Why don't you allow people to enjoy themselves? Why don't you allow people to dance? Why don't you allow them to literature? Why don't you allow them music? You are trying to define this country by the definition of Islam given by certain Mullahs, who want to make this country a theocratic state forgetting that Islam is all about Balance. The founder of Pakistan was a liberal, democratic, secular man. I have read Quaid i Azam Muhammad Ali Jinnah's speeches and his biographies; Quaid i Azam was an enlightened and balanced man. Why you are making him a conservative mullah.

The last point is future. Better future. Somebody has written a book about Balochistan, the title of the book is "Back to the Future". What do you mean by back to the future? It means that whenever you discuss the future of this province or this land, consider how it came into being? What were those factors, those historical factors? Nothing happens by chance in history. Everything happens for a reason and has a cause behind it. Don't interpret things in a wrong way, look at the history to clear your perspectives. If we want the history to play justice to us, we must first of all start doing justice to ourselves. CPEC is advancing – see what you can offer. I always ask youth about their ideas, about the thoughts running at the back of their mind. What are your symbols? It dawned upon me that we still are not agreed on mutual symbols; first we have to make our symbols same and then the effort can be put in to make them strong.

Thank you very much.

ڈاکٹر اسحٰق بلوچ
رکن مرکزی کمیٹی
نیشنل پارٹی

بلوچستان کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں کہ اس کے پاس ڈیویلپمنٹ کے لیے درکار تمام اہم عناصر موجود ہیں۔ بلوچستان میں ہم جتنی بھی قومی وحدتیں ہیں اپنی اپنی جگہ ہماری situation اور ہماری حالت بہت آئیڈیل ہے۔ دوسری جانب رقبہ کے مقابلہ میں ہماری آبادی بہت کم ہے۔ دنیا میں عام طور پر آبادی کو burden سمجھا جاتا ہے جبکہ ہماری بلوچستان کی آبادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بے پناہ معدنی وسائل کے ساتھ ساتھ طویل ساحل سمندر بھی بذات خود ایک بہت بڑا اثاثہ ہے۔ البتہ اگر یہ دیکھا جائے کہ صوبے کا خود اپنے پر اختیار کتنا ہے تو اس حوالہ سے مایوسی ہوتی ہے۔ درحقیقت بلوچستان کو اسلام آباد والوں نے کبھی بھی ڈویلپمنٹ کے پیراڈائم (paradigm) سے نہیں دیکھا بلکہ ان کے سامنے ہمیشہ سیکوریٹی پیراڈائم رہا ہے۔ جب تک یہ مائنڈ سیٹ تبدیل نہیں ہوگا بلوچستان کے مسائل اور مشکلات بدستور موجود رہیں گی۔

environment کی مثال لے لی جائے۔ اس وقت کوئلہ اور دوسرے ذرائع سے بجلی پیدا کرنے کے منصوبے شروع کیے گئے ہیں۔ ان منصوبوں کے جتنے بھی ماحولیاتی اثرات ہیں وہ بلوچستان میں ہوں گے اور یہاں کی مقامی آبادی اور لوگوں کو ہی برداشت کرنا پڑیں گے۔ لیکن ان منصوبوں کے ماحولیاتی جائزہ (assessment) کے حوالہ سے صوبوں کو کوئی اختیارات نہیں دیے گئے کہ آپ اپنی سفارشات دیں ہم اس پر کوئی عمل درآمد کریں گے۔ دوسری جانب ان منصوبوں کے فوائد زیادہ تر دوسرے صوبوں کے لیے ہیں۔

اسی طرح قدرتی وسائل کا معاملہ ہے۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد ایک آرٹیکل ۱۷۲ متعارف کرایا گیا ہے۔ اس آرٹیکل کی ذیلی دفعہ اے-۳ ہے۔ اس میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ آئل اینڈ گیس فیڈرل گورنمنٹ اور صوبے کا مشترکہ سبجیکٹ ہے۔ درحقیقت جب کوئی بھی چیز مشترک ہوتی ہے تو عمل درآمد بھی مشترک ہونا چاہیے۔ اگر آپ کی نیت صحیح ہے تو قدرتی وسائل سے متعلق فیصلے کرنے اور ان پر عمل درآمد کے لیے، خواہ ان کا تعلق لائسنس دینے سے ہو یا ایکسپلور کرنے سے، کوئی مشترکہ کمیشن ہونا چاہیے۔ یہی صورت حال اثاثوں اور آمدنی کی ہونی چاہیے۔ لیکن اس حوالے سے قومی اداروں کے ساتھ جو بھی معاہدات ہوئے ہیں ان کے بارے میں سوالات موجود ہیں۔ موجودہ بجٹنگ (budgeting) میں وہ بالکل برابر ہیں۔ اس آئین کی رو سے پی پی ایل یا گیس کی مد میں جو کچھ کمایا گیا ہے ان کا ۵۰ فیصد بلوچستان اور ۵۰ فیصد وفاق کا ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا کبھی حساب کتاب نہیں کیا جاتا کیونکہ اس حوالہ سے کونسل آف کامن انٹرسٹ (CCI) کا فورم عملاً non existent ہے۔

آئین میں یہ بھی موجود ہے کہ سی سی آئی کا ایک مستقل سیکرٹریٹ ہوگا۔ اگر واقعی سیکرٹریٹ بن جائے اور وہاں پر آپ کی نمائندگی ہوگی تو کوئی بھی مسئلہ وہاں آپ پیش کر سکتے ہیں۔ سیکرٹریٹ نہ بھی ہو تو یہ ایک دستوری ذمہ داری ہے کہ ہر ۹۰ دن بعد CCI کا اجلاس باقاعدگی سے ہو اور ہر چیز کو بروقت چیک کیا جائے گا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ سال ہو گیا ہے کہ حکومت نے اس کو دیکھا تک نہیں ہے۔ بہت ساری چیزیں ہوں گی جو وفاق کے دائرہ کار میں نہیں ہیں جبکہ کئی ایسی چیزیں ہیں جو پارٹ (۱) اور پارٹ (۲) میں بھی نہیں ہیں۔ اس صورت میں سارے معاہدے اور سارے ایگریمنٹ وفاق ہی کرتا ہے اور صوبہ عملاً نظرانداز ہوتا ہے۔ یہ صورت حال میرے خیال میں کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہے۔

اب آتے ہیں بالخصوص سی پیک کی طرف۔ andrew small کی حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب میں جو پاکستان چین تعلقات پر لکھی گئی ہے مصنف نے شروع میں ہی لکھا ہے کہ پاکستان والے کہتے ہیں کہ پاک چین دوستی ہمالیہ سے بلند، شہد سے میٹھی اور سمندر سے زیادہ گہری ہے۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ چینیوں کو پاکستان سے کوئی سروکار نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھنا چاہیے کہ سیندک میں کیا ہو رہا ہے۔ چند سال قبل جب چینیوں کے ساتھ معاہدہ ختم ہو رہا تھا تو وہ ۱۲۰۰۰ ٹن پراسیس کر رہے تھے۔ پھر ان کو کچھ سالوں کے لیے extention مل گئی۔ اب وہ ۲۰ ہزار ٹن کے قریب پراسیس کر رہے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ اس کی کوئی مانیٹرنگ نہیں ہو رہی ہے۔ جو کچھ یہ سیندک میں پراسیس کر رہے ہیں وہ سیدھا چین لے جایا جاتا ہے۔

سیندک کو اس سے قبل ڈیڑھ سال ہمارے لوگوں نے چلایا۔ اس وقت یہاں ۱۲۰۰ ملازمین تھے جن میں ۷۰ فیصد بلوچستان اور بقایا سندھ سے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے ۴۰،۳۵ کروڑ کا زرمبادلہ کما کر دیا۔ لیکن مرکزی حکومت نے انٹرنیشنل اور فارن فنڈنگ کے نام پر منصوبہ کو اپنے لوگوں سے لے کر چینیوں کو دے دیا۔ درحقیقت اس کی وجہ انٹرنیشنل اور فارن فنڈنگ نہیں بلکہ اس کے پس پردہ بعض دوسرے عوامل ہیں۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں ایک وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارا ملک ایک طرح کی isolation میں ہے جس کی وجہ سے چین پر ہمارا بہت زیادہ انحصار ہے اور اسی بنیاد پر ایسے بعض فیصلے ہوتے رہے ہیں۔

ہم سی پیک کی بات کرتے ہیں۔ پتہ نہیں ہم پر سی پیک کے سماجی، معاشی نقطہ نظر سے کیا مثبت اور منفی اثرات ہوں گے۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ سی پیک کی چینیوں کو ضرورت کیوں پڑی۔ بحیثیت ایک سیاسی ورکر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو South China Sea ہے وہاں پر جتنے بھی ملک ہیں ان کا جھگڑا ہے۔ آپ سب کو یاد ہوگا کہ کوئی پانچ چھ ماہ پہلے اس علاقہ میں جزیرہ پر چین نے قبضہ کیا تو امریکن بحری بیڑہ بین الاقوامی سمندر کو کراس کر کے آیا اور چین کی سمندری حدود میں داخل ہو گیا۔ اس پر دونوں ملکوں کے درمیان ٹینشن اس قدر بڑھ گئی کہ ہاٹ لائن پر دونوں صدور کو بات کرنا پڑی۔ امریکہ، تائیوان، جاپان ان سب سے چین کو اس علاقے میں خطرات ہیں۔ دوسری جانب چین کی صنعتوں کا کلی انحصار درآمدی تیل پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت South China Sea سے گزرنے والے تیل بردار جہاز سات متنازعہ علاقوں کو کراس کر کے جاتے ہیں۔ اس کے بعد چین میں اندرون ملک اسی تیل کی سنکیانگ جیسے علاقوں تک، جس کی اس وقت آبادی کم اور

رقبہ زیادہ ہے (آپ یہی سمجھیں کہ چین کا بلوچستان ہے)، سپلائی کے لیے غیر معمولی وقت اور اخراجات ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہفتے کے لیے بھی چین کے لیے تیل کی یہ رسد بند ہو جائے تو اس کی معیشت بیٹھ جائے گی۔ گوادر اس حوالہ سے متبادل اور محفوظ روٹ انہیں فراہم کرتا ہے۔

تیسری بات میری نظر میں یہ ہے کہ ہم لوگ سی پیک کے نام پر چینیوں سے سرمایہ لے لیتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں لیکن ابھی تک میری نظر سے کم از کم نہیں گزرا کہ یہ جو ادائیگیاں ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔ یہ گرانٹ ہے، قرضہ ہے، یا کچھ اور ہے۔ کس مد میں ہمیں یہ ۵۰ ارب ڈالر کے قریب امداد دے رہے ہیں۔ اس میں ۸ سے ۱۰ ارب کے قریب وسائل جو بلوچستان میں خرچ ہوں گے وہ گوادر کے قریب ائیر پورٹ کی تعمیر پر صرف ہوں گے یا کوئی اور چیز، جو بھی ضروری ہو۔ غالباً ان سب تعمیرات کو چینی ہی استعمال بھی کر رہے ہوں گے۔ اس صورت میں یہ تو چینیوں کے لیے نقد فصل کی طرح ہے کہ وہ اس سے کما بھی رہے ہوں گے اور اپنی اقساط اور رقوم بھی وصول کر رہے ہوں گے۔ دوسری جانب پوری دنیا کے ساتھ جھگڑے ہمارے بڑھے ہیں۔ انڈیا اور افغانستان تو بہت ہی نمایاں ہیں۔ تو آخر ہمیں حاصل کیا ہوا ہے؟ یہ سب امور CCI سے بھی متعلق ہیں۔ آخر بلوچستان کو کیا ملے گا؟ ریونیو کی حد تک کیا ملے گا، باقی مد میں کیا ملے گا۔ یہ جتنے بھی سوالات ہیں تشنہ ہیں۔ ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔

> بلوچستان کو مرکزی حکومتوں نے development کے پیراڈائم سے نہیں بلکہ سیکوریٹی پیراڈائم کے حوالہ سے دیکھا ہے اور یہی مسائل کی جڑ ہے۔

میں نے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تعلقات اور اس حوالہ سے آرٹیکل ۱۷۲ کی بات کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت بلوچستان نے اپنا کیس سی سی آئی میں جمع کیا ہے جس میں ۱۹۴۷ سے اب تک (۲۰۱۷) رولز اور قواعد وضوابط کو اسٹڈی کرنے کے بعد ان میں ترمیم کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ پہلے جو کردار ڈائریکٹر جنرل اور سیکریٹری پٹرولیم ادا کرتے تھے اب یہ ان کے دائرہ کار میں اس طرح نہیں ہے۔ اگر مشترکہ سبجیکٹ بن چکا ہے تو اس میں نئے قوانین کی ضرورت ہے۔ نئے طریقے سے ان پالیسیوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو رہا۔ فرض کریں کہ کسی چیز کو سی سی آئی میں لے جانے کے لیے متعلقہ وزارت سے صوبہ کو جواب چاہیے۔ لیکن وزارت کے لیے اس حوالہ سے کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہے۔ اگر وہ ایک سال تک اس کا جواب نہ دے اور اس کو اپنے ایجنڈے میں بھی نہ شامل کرے تو اس پر کوئی گرفت نہ ہو گی۔ اسی لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ رولز کو تبدیل ہونا چاہیے اور CCI کا مستقل سیکرٹریٹ ہونا چاہیے۔ یعنی جتنی بھی چیزیں ہیں ہمارے دائرہ اختیار میں ہیں ان سے ہر سطح پر مکمل طور پر آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ رہی بات معدنیات کی، تو یہ شروع سے ہمارا صوبائی حق تھا۔ یعنی اٹھارویں ترمیم سے پہلے بھی۔ اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ جتنی بھی ہماری وحدتیں ہیں وہ اپنی چیزوں کو initiate کریں۔ جو چیزیں نہ تو دستور میں دی گئی فہرست کے پارٹ (۱) میں ہیں اور نہ پارٹ (۲) میں ہیں، وہ صوبے کی ہیں تو اس حوالے سے قانون سازی کریں۔ اسی طرح پراپرٹی پر ڈیوٹیز ہیں۔ یہ بھی انہیں سمجھ نہیں آئی کہ یہ بھی صوبے کی ہیں۔ ہم نے اس کو CCI میں رکھا ہے اور یہ ان کی

ڈومین (Domain) میں ہے۔ صوبے اس کو initiate کریں جب کوئی اعتراض کرتا ہے تو CCI میں لے جائیں، کورٹس بھی موجود ہیں اور فورم بھی موجود ہیں۔

جہاں تک بات ہے قبائلی تقسیم اور اس سے متعلق مسائل کی تو بلوچستان میں جتنے بھی قبائل جدھر رہتے ہیں سب کی اپنی اپنی زمین ہے۔ صدیوں سے یہ ایک تقسیم ہے کہ یہاں اس قبیلے کی زمین ہے اور وہاں اس کی۔ پھر اسی طرح سے ذیلی قبائل کی اپنی تقسیم ہے۔ میرا تعلق خاران سے ہے اور شہر کو چھوڑ کر باقی خاران کی جتنی بھی زمین ہے اس میں وہاں کا کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہوگا جس کے پاس زمین نہیں ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ وفاق کی بھی کچھ دستوری ذمہ داریاں بنتی ہیں۔ جہاں ڈیم بننے کے مواقع ہیں وہ بلوچستان ہے۔ ورلڈ بینک نے ایک فزیبلٹی رپورٹ بنائی جس میں انہوں نے ایسے ۳۰۰ مقامات کی نشان دہی کی جہاں ڈیم بن سکتے ہیں۔ اب اگر ترپیلہ ڈیم سے دوگنا ہمارا پانی ضائع ہو رہا ہے تو وفاق کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کو روکنے کے لیے اقدامات کرے۔

> بجلی کے منصوبے بلوچستان میں شروع ہوں گے اس کے ماحولیاتی اثرات ہم پر ہوں گے جبکہ اس کے زیادہ فوائد دوسرے صوبوں کو ہوں گے۔

بلوچستان کے مسائل آخر کیا ہیں؟ ہماری معیشت، ہمارے قدرتی وسائل پر منحصر ہے مگر ان کے معاملات آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ سینڈک سے ہمیں ۲ فیصد سے بھی کم ملتا ہے لیکن ایگریکلچر پر اس طرح کا کوئی ٹیکس نہیں۔ بلوچستان کی ترقی کے لیے اس کے قدرتی وسائل کو تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے متعلق ایسے معاہدے ہوں جو بلوچستان اور یہاں کے لوگوں کے حق میں ہوں۔ اگر سینڈک چاغی میں ہے تو کم از کم اس کا ۲۰ فیصد چاغی پر خرچ ہونا چاہیے۔ ۶۰ فیصد بلوچستان اور ۲۰ فیصد وفاق کو ملنا چاہیے۔ ہم اس طرح کی چیزیں طے کر سکتے ہیں۔ وہ فورم اور ادارے موجود ہیں مگر بدقسمتی سے موجودہ [نواز شریف] حکومت اتنا مرکز پسند ہے کہ ہر چیز کو انہوں نے rename کیا ہے۔ اب ایجوکیشن devolve ہو گیا ہے مگر کریکولم انہوں نے واپس لے لیا، زراعت کو کسی اور نام سے رکھ لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اٹھارویں ترمیم کے بعد جو چیزیں صوبوں کو منتقل ہو گئی ہیں ان میں اسلام آباد کے اختیارات اسلام آباد سے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اب جو محکمے devolve ہوئے ہیں تو اس سے پہلے وفاق ان پر جتنی رقم خرچ کرتا تھا وہ

> سی پیک چین کی اپنی ضرورت ہے کیونکہ وہ اپنے لیے تیل کی بلا کسی خطر رسد برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے ہمیں بھی فائدہ ہوگا لیکن جو کچھ ہو رہا ہے اس میں شرائط کیا ہیں اور آخر کار بلوچستان کو واقعی کیا مل جائے گا، کچھ واضح نہیں ہے۔

این ایف سی ایوارڈ کے تحت صوبوں میں تقسیم کر دینی چاہیے۔ مسائل کے حل کے لیے آئین میں جو اختیارات ہیں ان کو صحیح معنوں میں نافذ کریں۔

آخر میں ایک اور بات کروں گا کہ ایک اور مائنڈ سیٹ ہے جو diversity کو کمزوری سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ ریاست کی طاقت ہوتی ہے۔ اب جتنی بھی اقوام ہیں بلوچ ہے، سندھی ہے، پنجابی ہے یا پشتون ہے یہ diversity وفاق کی طاقت ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ، ثقافت اور شناخت کا تحفظ وفاق کی دستوری ذمہ داری بنتی ہے۔ یہ جو مردم شماری ہے اس کے حوالے سے کوئی تیاری نہیں تھی۔ اس لیے میں دیکھ رہا ہوں کہ حالات بہت خراب ہوں گے۔ اگر بلوچ کو اقلیت میں تبدیل کیا گیا تو یہ بہت ہی خطرناک بات ہو گی۔ آخر میں، میں آپ سب دوستوں کا مشکور ہوں، سننے کا بہت بہت شکریہ

آپ دوستوں کا شکریہ کہ مجھے بولنے کا موقع دیا۔

بلوچستان کی اہمیت کے اظہار کے لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بلوچستان اگر نہ ہو تو پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ محض زبانی باتیں ہیں حقیقت سے ان کا دور کا تعلق نہیں ہے۔

بلوچستان میں رہنے والے پشتون ہوں یا بلوچ ہمارے اپنے اطوار اور روایات ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں میں ان میں سے ہر ایک پہاڑوں کی مانند ہے۔ ان سے طاقت کی زبان میں بات کی جائے گی تو پھر اس کے مطابق ہی جواب ملے گا۔ اسی حوالہ سے جب اکبر بگٹی کا قتل ہو رہا تھا تو ہم نے ارباب اختیار سے کہا کہ زندہ اکبر بگٹی سے مردہ اکبر بگٹی آپ کے لیے زیادہ خطرناک ہوگا۔ اور اس کے اثرات آج آپ دیکھ رہے ہیں۔

بلوچستان سرینا ہوٹل کا نام نہیں ہے۔ معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ یہ ایک وسیع و عریض علاقہ ہے جہاں لوگ آباد ہیں۔ ان کے حالات کو سمجھنے کے لیے دیکھنا ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں خود خضدار سے ہوں اور نقل مکانی کر کے کوئٹہ منتقل ہوا ہوں۔ میں ایک جامع مسجد میں فی سبیل اللہ ۳۰ سال سے خطبہ دیتا تھا۔ اس سے آپ کو علاقہ میں میری حیثیت اور کردار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن خود میرے ساتھ کیا ہوا۔ میرے گھر کے دروازے پر شام ۵ بجے کے وقت میرے بیٹے پر دو طرف سے ٹارگٹ کلنگ کی جاتی ہے۔ وہ شدید زخمی ہوا لیکن اس کی قسمت تھی کہ بچ گیا۔ لیکن پھر ۱۸ اگست ۲۰۱۶ کے کوئٹہ دھماکہ میں وہ شہید ہو گیا۔ تو تک خضدار شہر سے پیچھے ایک علاقہ ہے وہاں سے اجتماعی قبریں برآمد ہوئی ہیں۔ سردار علی محمد قلندرانی جو توتک میں ہے اور خود بھی اپنے قبیلہ کا سردار ہے۔ اس کے ۳ بیٹے ۲۰۱۳ سے بمع ۱۱ آدمیوں کے لاپتہ ہیں۔ اس وقت تک ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے بے چارا سیاسی جماعتوں سمیت ہر ایک زید، بکر، عمر غرض سب کے پاس گیا لیکن اس کی کوئی دادرسی نہیں کی گئی۔ ہائی کورٹ نے ایک کمیشن بنایا۔ جس شخص پر الزام تھا بجائے اس کو سیشن کورٹ خضدار بلانے کے جج صاحبان نے ان کے گھر جا کر بیان قلم بند کیا۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب ہمیں عدلیہ سے امید ہے اور نہ ہی انتظامیہ سے کوئی توقع ہے۔

کیا ہماری اس صورت حال کا آپ کو اندازہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جتنا پاکستان آپ کا ہے اتنا ہمارا بھی ہے اور آپ ہی کی طرح ہمارے بھی حقوق ہیں۔ ہم وہی حقوق مانگتے ہیں۔ ہم کسی سے خیرات یا زکوٰۃ نہیں

قاضی عبدالحمید شیرزاد
ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

مانگتے۔ ہمارے حقوق کو آئینی تحفظ دیا جائے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہمیں انسان سمجھا جائے۔ ہمارے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک نہ کیا جائے۔ زبان کی سختی کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں بتایا جائے کہ ہمارا قصور کیا ہے۔

باقی جو CPEC اور اس سے متعلق معاملات ہیں ان پر کچھ لوگوں نے پہلے ہی تفصیلی بات کی ہے۔ میں نے صرف اتنی گزارش کرنی ہے کہ یہ ہمارے وسائل اور سی پیک کی 'برکت' ہے کہ ہمیں اس سب مار دھاڑ کا سامنا ہے۔ میرے بیٹے کے بارے میں ایک سینئر اہلکار کے استفسار پر میں نے جواباً کہا کہ آپ نے اسے مارا ہے۔ کیونکہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ بہت سے مارنے والوں کو کسی نہ کسی درجہ میں خود اداروں کی جانب سے تحفظ ملا ہوتا ہے۔ اور یہ بات ہم ہی نہیں کہتے بہت سے لوگ جو اسی نظام میں ذمہ دار ہیں تسلیم کرتے ہیں۔

در حقیقت جب تک تعصب کی عینک کو اتار کر حقائق کی عینک سے نہ دیکھا جائے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ آپ تشریف لائے بے شک آپ نے ہمیں ایک اچھا موقع فراہم کیا ہے، آپ ہمارے ساتھ شیئر کر رہے ہیں اور ہم آپ کے ساتھ حالات و واقعات شیئر کر رہے ہیں۔ دل دکھانے کی چیز نہیں ہے، کبھی آپ کو وقت ملے تو کوئٹہ کے بجائے آپ نوشکی جائیں، خضدار جائیں، ڈیرہ مراد جائیں، آپ سبی اور ڈھاڈر جائیں، ژوب جائیں، قلعہ سیف اللہ جائیں، موسیٰ خیل جائیں، میں خضدار سے ہوں اور آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ سب سے پہلے وہاں آئیں تو آپ کو زمینی حالات سے حقیقی واقفیت ہو گی۔

انتہائی دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں انتخابات میں نشستیں بھی ادارے تقسیم کرتے ہیں کہ ڈھائی سال تم وزیر اعلیٰ اور ڈھائی سال تم، یہ حقائق ہیں۔

ان کلمات کے ساتھ اگر کوئی زبانی گستاخی ہوئی تو معذرت چاہتا ہوں۔ آپ سب کا شکریہ

شام کمار
دانشور، مصنف

تیسری دنیا کے ممالک کو جن میں پاکستان بھی شامل ہے اس وقت جو خطرات لاحق ہیں انہیں مختلف زاویے سے دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں اس حوالہ سے جب تک ہم تہذیب، کلچر اور تاریخ کی تہہ میں نہیں جائیں گے تب تک مسائل کی درست طور پر نقاب کشائی نہیں ہو سکے گی۔ بلوچستان کی صورت حال بھی اس میں شامل ہے۔

مجھے اجازت دیں ماضی میں جانے کی۔ اس ضمن میں میں تین سامراجوں کا ذکر کروں گا جو موجودہ ہسٹری کے نمایاں سامراج ہیں۔ ان میں ایک سفید سامراج ہے، ایک کالا سامراج اور اب ایک پیلا سامراج ہے جو طوفان کی طرح ابھی آرہا ہے۔ ماضی میں جانے سے پہلے میں تین چار ملکوں جن میں امریکہ، غیر منقسم ہندوستان اور پاکستان نیز چین کا ذکر کروں گا۔

۱۶۳۴ میں امریکہ کے ایک علاقے میں یورپ سے ایک جہاز لنگر انداز ہوتا ہے۔ اس میں یورپ، خاص طور پر برطانیہ کے سزایافتہ لوگ تھے۔ ان کے ساتھ پادری تھا، پادری کے ساتھ کتاب تھی اور پادری اور کتاب کے ساتھ ساتھ ان کا خدا بھی تھا۔ جب جہاز لنگر انداز ہوتا ہے تو وہاں کے لوکل لوگ جس میں کئی قبائل سمیت ریڈ انڈینز اور پکرز بھی شامل تھے ان کو پادری نے کتاب کے حوالہ سے کہا کہ ہم تمہیں مذہب دینے اور تہذیب سکھانے آئے ہیں۔ مذہب کو بشارت قرار دیتے ہوئے انہوں نے مقامی آبادی کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا، انہیں زندہ جلایا اور اس طرح مارا پیٹا کہ صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا گیا۔ اب ان لوگوں کو ہم فلموں میں دیکھتے یا پھر کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ نہ ریڈ انڈینز کہیں نظر آتے ہیں اور نہ ہی پکرز نظر آتے ہیں۔ بعد میں ایک امریکی دانشور نے تبصرہ کیا کہ وہ لوگ اس وقت جو خدا لائے تھے ان کا وہ خدا ہمارے پاس ہے اور ہماری زمینیں ان کے پاس ہیں۔

دکھ اور درد کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے امریکی دانشوروں نے ان لوگوں کے لیے یہی بیانیہ دیا کہ ان مقامی لوگوں کو ہم تہذیب سکھانے آئے تھے۔ یہ وحشی تھے، ان کو ہم انسان بنانے آئے۔ میکسیکو کے ساتھ بھی انہوں نے یہی عمل کیا۔ یہ جو مذہب، کتاب اور خدا لے کر آئے تھے وہ تین چیزیں انہوں نے مقامی لوگوں کو دے دیں اور ان کی زمین اپنے پاس رکھ لی۔

دوسری جانب ۱۶۱۵ میں برطانیہ سے ایک شخص وہاں کے بادشاہ کا پروانہ لے کر بطور سفیر ہندوستان کے بادشاہ جہانگیر کے دربار میں آتا ہے۔ یہی خط وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بطور ایک کارپوریشن بنیاد رکھنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس بنیاد سے پہلے انہوں نے ساؤتھ میں کوٹھیاں قائم کیں اور پھر آہستہ آہستہ

بمبئی اور سورت میں قیام کر گئے۔ بنگال کو بھی انہوں نے مرکز بنایا۔ اسی طرح بتدریج اپنی تجارت کو بڑھانے کے لیے انہوں نے اپنی مختلف آؤٹ پوسٹس قائم کیں۔

corroboratorsوہاں پر بھی تھے اور یہاں پر بھی ہیں۔ سنٹر میں ہیں اور یہاں پر بھی ہیں تو آئینی تحفظ اگر ہمیں مل بھی جاتا ہے تو یہ محض کتاب کی طرح ہے۔ جب تک corroborators یہاں پر ہیں تو یہ ملک صحیح طور پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اور جیسے منیر جان نے کہا کہ خاص طور پر بنگال کی مثال اہم ہے جس کو انہوں نے دھکا دے کر الگ کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ باہر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے رابطے کی زبان ہے۔ لیکن نہیں مانے اور نتیجتاً خون ریزی ہوئی۔ ہندوستان کے آئین میں ۱۲/۱۳ قومی زبانیں ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی ایسا ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری زبانوں کو کیوں وہ درجہ نہیں دیتے۔

پھر میں اس جانب آتا ہوں لارڈ کلائیو جب ہندوستان آیا تو ۱۷۵۷ میں گٹھ جوڑ کر کے سراج الدولہ کو شکست دی۔ اس وقت کے corroboratorsمیں جعفر تھا اور صادق تھا دکن والا۔ یہاں بھی وہی ہیں نام بدلے ہوئے ہیں، چہرے بدلے ہوئے ہیں، عمل اور کردار وہی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آنے والا آہستہ آہستہ اپنی حکمرانی قائم کرتا ہے۔ ہندوستان اس زمانے میں دنیا کی اکانومی کا ۲۷ فیصد تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کم ہو کر یہی ۲۳ فیصد رہ جاتا ہے۔ اندازہ کریں کہ اس دور میں کتنا بزنس تھا۔ اس وقت ان کے جو کارخانے تھے کاٹن کے کپڑے کے اور نفیس قسم کا کپڑا پوری دنیا میں جاتا تھا۔ اس کی مانگ تھی لوگ خوشحال تھے سونے کی چڑیا کہتے تھے ہندوستان کو، لیکن باہر سے تجارت کے نام پر آنے والے لوگوں کی وجہ سے صورت حال الٹ گئی۔ وہ جو کارپوریشن تھی تاجر تھے انہوں نے ملک کو فتح کیا۔ یہ شاہ عالم دوئم کا زمانہ تھا۔ پھر انہوں نے ملک کو نچوڑا۔ اس دوران قحط سالیاں ہوئیں بے شمار لوگ مارے گئے۔ بعد میں یہ لوگ بنگال کو تقسیم کر کے گئے۔ اب جو قبائلی تقسیم کی بات ہوتی ہے یہ اسی وقت سے شروع ہوئی ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مختلف مذاہب کے لوگ صدیوں سے ساتھ رہ رہے تھے تو انہوں نے ان کو تقسیم کرنے کی بات کی۔ یہ تقسیم اور قبائلی تقسیم اسی وقت وجود میں آئی۔ اس میں کاسٹ، ٹرائب یہ سب شامل تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تقسیم وہاں سے آئی۔

۱۹۳۹ میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوتی ہے تو اس جنگ میں نازیوں نے دو بڑے ملکوں پر قبضہ کیا۔ ایک یوگوسلاویہ اور دوسرا فرانس۔ دونوں ملکوں میں انہوں نے وہاں کے مقامی corroborators کی حکومت قائم کی۔ حاکم تو یہ لوگ خود تھے مگر وہاں corroboratorsبٹھائے تھے اور وہاں کی باگ ڈوران کو سونپی تھی۔

ہندوستان میں جب لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو انہوں نے ۱۸۵۷ میں جنگ آزادی لڑی جس کو sepoy rebellion کہا جاتا تھا انگریزوں کے ہاں، جبکہ ہم جنگ آزادی کہتے ہیں۔ اور پھر جو Jewel of India ہے وہ برٹش کے کراؤن میں لگ گیا۔ جس طرح بلوچستان مرکز کے کراؤن میں لگا ہوا ہے۔ ابھی آپ مثال دے رہے تھے سنکیانگ کی کہ وہ چین کا بلوچستان ہے۔ سنکیانگ میں کچھ بھی نہیں ہے اور یہاں سب کچھ ہے۔ دو چیزیں ہیں ایک ہے دریافت شدہ معدنیات و وسائل اور دوسرے ہیں غیر دریافت شدہ جو دریافت شدہ سے

بھی زیادہ ہیں۔ تیل ہمارے پاس ہے، گیس ہمارے پاس ہے، قیمتی پتھر ہمارے پاس ہے، سونا ہے، چاندی ہے، تانبا ہے، پتہ نہیں کیا کچھ ہے ہمارے پاس مگر ہم بھوکے ہیں۔ ہمارے کشکول کا سائز بڑھتا جارہا ہے۔

شرم کی بات ہے کہ جب ہم اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں تو اپنے آدرشوں کو بھول جاتے ہیں، بھٹک جاتے ہیں اور بھٹکتے بھی دانستہ ہیں۔ تو جس قوم کا، جس گروہ کا یا جس فرد کا کوئی آدرش ہی نہیں ہوگا وہ کہاں سے ترقی کرے گا۔ کشکول ان کا بڑھتا جائے گا جو کہ بڑھتا جارہا ہے۔ کیا کچھ نہیں ہے اس ملک میں۔ جاپان میں تو کچھ نہیں ہے اور اکنامی میں امریکہ کا مقابل ہے۔ ہمارے پاس تو سب کچھ ہے مگر یہ سب تو کہنے کی ہی باتیں ہیں۔

اب آتے ہیں کلچر کی طرف۔ چین کی آپ ہسٹری کو دیکھیں، جان لیں کوئی آپ کا دوست نہیں ہے۔ سب مفاد پرست ہیں۔ ان کے لیے ان کے مفادات مقدم و اولین ہیں۔ آپ کی حیثیت تو سیکنڈری بھی نہیں ہے۔ اس کو سمندر چاہیے تو سمندر تک پہنچے گا۔ اس کے لیے آپ کو ۵۰ ارب ڈالر بھی دے گا، سڑک اور راستہ بھی دے گا۔ سب کچھ دے گا۔ مگر کیوں دے گا؟ اس کا اپنا مفاد ہے۔ انگریزوں نے یہاں پر کمیونیکیشنز اور ریلوے کا جال بچھایا۔ کیا یہ یہاں کی آبادی کے لیے تھا؟ نہیں، اس کا اپنا مقصد تھا۔ سارے ملک کو لوٹ کر لے گیا۔ اور لوگ خود کشیاں کرتے تھے۔ یہ انڈسٹریل ریوولیوشن جو انگلینڈ میں آیا وہ یہاں کے پیسے سے آیا۔ یہاں نہیں آسکتا تھا کیا۔ اس سے زیادہ ہم ترقی یافتہ تھے۔ یہاں کی تہذیبوں کو دیکھو، انڈس سویلائزیشن کو دیکھو، لیکن اب ہم سب کچھ بھولتے جارہے ہیں۔

جب عالمی جنگ ختم ہو جاتی ہے تو سرد جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اور کچھ سیٹلائٹس سوویت یونین جبکہ کچھ امریکہ کے بن جاتے ہیں۔ ہم بھی امریکہ کی سیٹلائٹ تھے۔ ہماری فارن پالیسی اس کے ساتھ نتھی تھی۔ چنانچہ ہم استعمال ہوئے۔ اگر ہم استعمال نہ ہوتے تو کلاشنکوف اور ہیروئن کلچر یہاں کبھی متعارف نہیں ہوتا۔ کلچر بہت بڑی چیز ہے۔ جس میں زبان بھی ہے، لٹریچر بھی ہے، سب کچھ ہے۔ لیکن کلچر تو آپ ختم کرتے جارہے ہیں۔ بنگالیوں نے اپنی زمین کو خون سے سینچا اور تب جا کر اپنی زبان کو قومی زبان کا درجہ دلوایا۔ ہم نے کیا کیا، جب عطاء اللہ مینگل وزیر اعلیٰ تھے، ڈاکٹر عبدالحئی آیا تھا اور ہم بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے کہا کہ بھائی تم لوگ بلوچی زبان کو کیوں قومی زبان کا درجہ نہیں دے رہے، اُردو کو کیوں دے رہے ہو؟ تو وہ جواب نہیں دے پایا۔ اب تو اس قسم کے لوگ ہیں ہی نہیں جن سے بات بھی کی جاسکے۔

سرد جنگ کے بعد یونی پولر دنیا قائم ہو جاتی ہے۔ اب ایک سپر پاور رہ جاتی ہے۔ جو کہتا ہے کہ سب سے زیادہ مہذب ہوں اور سب سے زیادہ طاقتور ہوں۔ لیکن یہاں سے ایک اور پاور اٹھتا ہے اور میں اسے یلو پاور کہتا ہوں۔ اس یلو پاور کی بھی اپنے ہمسائیوں کے ساتھ زمین پر اور جزیروں پر جھگڑے ہیں۔ اور جنگیں بھی ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے ویت نامی کامریڈ ہو چی من کو بھی نہیں بخشا۔ ۱۹۷۹ میں اس کے ساتھ دو جنگیں بھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ساؤتھ چائنا سی میں بھی مسائل ہیں۔ اب سرد جنگ کے بعد یہاں چین اور بھارت دو core states بن رہی ہیں۔ جبکہ دیگر سیٹلائٹس بن رہے ہیں۔

معاشی ترقی جس ملک میں ہو گی، کلچرل ترقی بھی ہو گی۔ یہاں بلوچستان میں معاشی ترقی نہیں تو پھر کلچرل ترقی کیسے ہو گی۔ پھر وعدہ خلافیاں ہوئی ہیں، فوج کشیاں ہوئی ہیں اور خون ریزی ہوئی ہے۔ یہاں پر کیا کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں ایک دو مثالیں دوں گا۔ یعقوب بزنجو یہاں سیندک پراجیکٹ کا ایم ڈی تھا۔ ایک دن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ سیندک پروجیکٹ یہاں ہے اور اس کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد لے جا رہے ہیں۔ یحییٰ بختیار صاحب کی دوستی ہے، آپ مہربانی کریں ان سے کہیں کہ وہ بی بی سے اس سلسلے میں بات کریں۔ بی بی اس وقت حاکم تھیں۔ میں نے یحییٰ بختیار سے بات کی اور اس نے بی بی سے بات کی۔ کچھ دنوں کے بعد کہا کہ بات نہیں بنی۔ کیونکہ یہاں ڈیموکریٹک حکمران بھی شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ پھر نواب اکبر بگٹی سے میں نے بات کی کیونکہ وہ اس وقت وزیر اعلیٰ تھے۔ نواب بگٹی چونکہ نڈر آدمی تھے، وہ پروا نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے ہیڈ کوارٹر یہاں بنوایا۔ پھر جب سیندک پروجیکٹ آپریشنل فیز میں آتا ہے تو اس وقت نواز شریف حاکم ہوتا ہے۔ انہوں نے اس سے منع کیا اور تنخواہیں بند کر دیں۔ یعقوب بزنجو صاحب نے وہ مال بیچ کر تنخواہیں دیں اور پھر اس کا ٹرانسفر لاکڑہ پروجیکٹ میں کر دیا گیا۔

پھر یہ بات دہرانے کی ضرورت ہے کہ ملائشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، فلپائن اور کوریا وغیرہ بنیادی طور پر چینی آبادیوں کا تسلسل سمجھے جاتے ہیں اور کنفیوشس کلچر کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہ بہت بڑی پاور ہے جس سے یہ جان نہیں چھڑا سکتے۔ کنفیوشس کا فلسفہ یہ ہے کہ ڈسپلن، آرڈر، اتھاریٹیرین ازم اور collectiveism جبکہ ہماری فلاسفی individualism، ڈیموکریسی وغیرہ ہے۔ خیر بخش مری کہا کرتے تھے کہ میں پارلیمانی سسٹم پر یقین نہیں رکھتا۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ اچھا نہیں لگتا تھا۔ جبکہ نواب بگٹی پارلیمانی نظام پر یقین رکھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ فریقین کے درمیان پل بنے ہوئے تھے۔ لیکن اس پل کو گراتے ہوئے بھی انہوں نے دیر نہیں کی۔ جب ملک کے ایک حصے کو انہوں نے دھکیل دیا تو نواب صاحب کی کیا حیثیت تھی۔

یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں۔ آپ سیاسی لوگ بیٹھے ہیں، اپنے لیڈروں کے پاس بھی جاتے ہیں۔ تھوڑی سی مراعات پر چپ نہ کریں بلکہ ڈٹ جائیں۔ یہ اٹھنے کا وقت ہے۔ ورنہ یہ چیزیں آئین میں لکھ بھی دی جائیں ان پر عمل نہیں ہو گا۔ اس سے زیادہ میں آپ کا وقت نہیں لوں گا۔ شکریہ

یار جان بادینی

دانشور، صحافی

میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کا مشکور و ممنون ہوں کہ وہ یہاں آئے اور یہاں بیٹھی بلوچستان کی کریم سے گفتگو کر کے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میں پنجاب کے چند بیوروکریٹس جو یہاں پر مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہے ہیں، کے مشاہدات آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں جن سے زمینی حقائق کی تصویر ان ہی کی زبانی سامنے آجاتی ہے۔ ایک کے علاوہ یہ تمام اقتباسات روزنامہ جنگ کوئٹہ کی اشاعتوں میں شائع ہونے والے ارشاد احمد حقانی کے کالموں سے لیے گئے ہیں۔

[طوالت کے باعث یار جان بادینی صاحب کے پیش کیے گئے اقتباسات کے بعض حصے حذف کر دیئے گئے ہیں۔]

''میری بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ڈھاڈر (ضلع کچھی جو کہ اب ضلع بولان کہلاتا ہے) میں ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔ ان دنوں جرگہ سسٹم رائج تھا یعنی پورا سول اور کریمنل لا جرگہ کے ماتحت تھا، صرف قاضی کی عدالتیں تھیں۔ سول جج یا ایڈیشنل سیشن جج کی عدالتیں بھی نہ تھیں۔ اے سی اور ڈی سی ہی ان عدالتوں کے سربراہ تھے۔ میرے تحت علاقہ میں واحد پکی سڑک جو نیشنل ہائی وے تھی، کوئٹہ سے ہوتی ڈھاڈر سے گزرتی جیکب آباد تک جاتی تھی جو کہ اب بھی ہے مگر سارا ڈویژن Interior میں تھا وہاں سارے ضلع بولان میں ایک فٹ بھی پکی سڑک نہ تھی۔ ڈھاڈر سے تحصیل شوران، تحصیل کھٹن، تحصیل سنی تمام راستے سو سو کلو میٹر تک کچے تھے۔ پکی یعنی کالی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسی طرح حاجی شہر و تحصیل کا تمام علاقہ کھالوں، کھیتوں سے پگڈنڈیوں کی صورت میں تھا، سڑک مفقود تھی۔ میں نے ڈیڑھ سال کچے راستوں پر سفر کیا بعض اوقات گاڑی کا ٹائر اور سٹپنی بھی بیکار ہو گئے تو تیس تیس میل پیدل سفر کرنا پڑا، تب جا کر کوئی گاؤں آیا اور ٹائر کا بندوبست ہوا۔

میری دوسری تعیناتی ضلع نصیر آباد کی ایک اور دورہ افتادہ تحصیل اور سب ڈویژن چھتر میں ہوئی۔ پورے سب ڈویژن میں ایک انچ بھی پکی سڑک نہ تھی اور نہ اب ہو گی۔ ڈیرہ مراد جمالی (ضلعی ہیڈ کوارٹر) سے سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹر چھتر تک تیس کلو میٹر راستہ کھیتوں اور کچی مٹی کی پگڈنڈیوں پر مشتمل تھا۔ باقی سارا سب ڈویژن اسی طرح دھول سے اُٹے راستوں سے پُر تھا، سڑک نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بجلی نام کی نعمت میسر نہ تھی۔

تیسری تعیناتی جھل مگسی میں ہوئی۔ جھل مگسی مین نیشنل ہائی وے پر واقع نوتال گاؤں سے ۱۲۰ کلو میٹر مسافت پر تھا اور پورے راستے میں نہ کوئی شہر تھا نہ ہوٹل نہ ٹائر کی دوکان اور سارا فاصلہ کچے راستے پر

مشتمل تھا۔ دھول زدہ مٹی کی وجہ سے وائپر چلانے پڑتے تھے تب راستہ نظر آتا تھا۔ بجلی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ پانی یا واٹر سپلائی کی کوئی نعمت موجود نہ تھی۔ میں ایک کچے کمرے میں رہتا تھا۔ جون جولائی کی گرمی میں میں خود درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر ہاتھ والا پنکھا جھلتا تھا۔ باقی سارے سب ڈویژن کے باسی Donkey fan کے ذریعے ہوا کا بندوبست کر کے رات گزارتے تھے۔ تمام گاؤں کے لوگ اور جانور ایک ہی تالاب سے پانی پیتے تھے۔

میری تعیناتی بطور ڈی سی نصیر آباد اور بولان بھی رہی بطور ڈپٹی کمشنر پشین جو کہ پشتون علاقہ تھا وہاں میں سختی اور مشکل موسمی حالات سے بچا رہا اور روزمرہ ضروریات اور بجلی اور سڑک کی نعمتوں سے محروم نہ رہا۔ وہاں کا علاقہ شاداب و آباد کاریزات سے پُر تھا۔ آپ کسی بھی پھل کا نام لیں وہ ضلع پشین میں موجود تھا۔ اللہ کی ساری نعمتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ بجلی سارے ضلع میں تھی اور سڑکیں بھی تھیں۔

جناب والا! میری ان معروضات کا مقصد صرف یہی ہے کہ بلوچ ایریا میں بڑے پیمانے پر تعمیراتی اور ترقیاتی کام کی ضرورت ہے۔ بجلی، پختہ تارکول کی سڑکیں، اسپتال شفاخانے، کالج اسکول اہم ضرورت ہیں۔ ایک ہنگامی ترقیاتی پروگرام کی ضرورت ہے۔ وہاں کا دیہاتی بلوچ ہم سے نئے زمانے کی ترقی کا حصہ اور حق مانگتا ہے۔ بلوچستان کا سارا علاقہ ہی دیہاتی غیر ترقی یافتہ ہے۔" [نصراللہ خان، سابق سیکریٹری پرائیوٹائزیشن بورڈ پنجاب، روزنامہ جنگ کوئٹہ میں ۲۷ فروری ۲۰۰۵ کو شائع ہونے والے مضمون سے اقتباس]

"۹۷-۱۹۹۶ء میں میں بطور کمشنر سبی ڈویژن جب اختر مینگل اس وقت بلوچستان کے وزیر اعلیٰ تھے تعینات رہا اور اس طرح مجھے بلوچ رہن سہن اور ان کے رویوں کو سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ حالیہ مباحثے میں ایک سرکاری حلقے نے اس رائلٹی کا بھی ذکر کیا ہے جو سوئی گیس کی وجہ سے نواب محمد اکبر خان بگٹی کو مبینہ طور پر دی جاتی ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ رائلٹی کے بارے میں صحیح تصویر پیش کر دیا جائے تاکہ اس ضمن میں موجود غلط تصورات کو رفع کیا جا سکے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ساڑھے بارہ فیصد کے حساب سے جو رائلٹی، جس میں ایکسائز ڈیوٹی اور ڈویلپمنٹ سرچارج بھی شامل ہے (یہ رقم غالباً ۵ بلین کے قریب ہے) صوبے کو ادا کی جاتی ہے۔ وہ وفاق سے براہِ راست بلوچستان کے Provincial Consolidated Fund میں چلی جاتی ہے۔ اس رقم سے نواب کا یا اس کے قبیلے کا کوئی لین دین نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو بگٹی قبیلے یا ذیلی قبیلوں کو دی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ سوئی گیس کے پلانٹ اور بڑی بڑی پائپ لائنوں نے ڈیرہ بگٹی میں مختلف ذیلی قبیلوں کی سینکڑوں کلومیٹر جگہ گھیری ہوئی ہے۔ سیکورٹی کے پیش نظر ارد گرد بھی وسیع جگہ چھوڑنی پڑتی ہے جس پر بگٹی کا کوئی قبیلہ کسی قسم کی کاشتکاری نہیں کر سکتا۔ یہ رقم اصل میں اسی جگہ کا کرایہ ہے جو پی پی ایل ان قبیلوں کو ادا کرتا ہے۔

اگر سوئی کے قصبے سے PPL Installations جو ان کے اہلکاروں کے وسیع و عریض گھروں، اسپتال، کلب، کیفے ٹیریاز پر مشتمل ہیں نکال دی جائیں تو باقی ٹاؤن اسی حالت میں ہے جو ایک ہزار سال پہلے تھی۔ مٹی کے بنے ہوئے گھر، نہ پانی کا صحیح انتظام نہ جلانے کے

لئے گیس، ساری کی ساری آبادی خط افلاس سے نیچے رہ رہی ہے جبکہ SSG کے اہلکاروں کا طمطراق و کروفر دیکھنے کے قابل ہے۔ اگر یہ ٹاؤن یورپ میں ہوتا تو ایک ماڈل ٹاؤن بن چکا ہوتا۔ PPL کی آمدنی اربوں روپے ہے انہیں چاہئے کہ اپنی آمدنی کا ایک یا دو فیصد حصہ ٹاؤن کی ڈویلپمنٹ اور بلوچی کشیدہ کاری کے مراکز قائم کرنے پر، جہاں بلوچ بیوہ عورتیں اپنے ہنر کو کام میں لا کر اپنے لئے معقول روزگار پیدا کر سکیں، صرف کریں۔

مرکز کی بلوچستان میں دلچسپی یا عدم دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرکزی وزراء صبح کی فلائٹ سے کوئٹہ آتے تھے وہاں سرینا ہوٹل میں قیام کرتے تھے اور اپنی میٹنگ Attend کرنے کے بعد شام کی فلایٹ سے کراچی چلے جاتے تھے۔ بہت کم وزراء نے کبھی کوئٹہ سے سڑک کے ذریعے اندرونِ بلوچستان جانے کی زحمت کی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ وفاق میں اندرون بلوچستان پائی جانے والی پسماندگی، غربت اور احساسِ محرومی کا پورا شعور کبھی پیدا نہ ہو سکا ہے۔

بطور کمشنر میں نے سبی سے ڈیرہ بگٹی کی پختہ سڑک جو ۱۲۲ کلو میٹر پر پھیلی ہوئی ہے بنانے کی سر توڑ کوشش کی، صوبائی حکومت کے ساتھ ساتھ اس وقت کی مرکزی حکومت کو بھی اس سلسلے میں متحرک کرنے کی مساعی کی لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا، کتنے دکھ کی بات ہے کہ پاکستان بنے 58 سال ہو گئے لیکن یہ سڑک ابھی تک Tyre Track پہیوں کے نشان پر ہی مشتمل ہے۔ بارش کی صورت میں کچی سڑک کہیں دو کلو میٹر اور کہیں پانچ کلو میٹر برساتی نالوں کے نیچے آجاتی ہے جس سے ڈیرہ بگٹی سے سبی ہائی وے روڈ کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔'' [خواجہ محمد طارق سابق سابق کمشنر سبی ڈویژن کے خط سے اقتباس، روزنامہ جنگ کوئٹہ کی ۱۳ فروری ۲۰۰۵ کی اشاعت میں ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم میں شائع کیا]

''بلوچستان پاکستان کا ایک بہت ہی پسماندہ صوبہ ہے۔ آزادی کے بعد بھی گزشتہ ستاون برس میں چند پختون علاقوں کے علاوہ اس صوبہ میں بالعموم اور بلوچ علاقوں میں بالخصوص معاشی حالات میں کوئی قابل ذکر بہتری نہیں ہوئی۔

۱۹۷۰ء تک بلوچستان کے عوام میں پنجاب کے خلاف کوئی نمایاں نفرت نہیں تھی۔ بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے اساتذہ مقامی اسکولوں میں بھی تعلیم کی روشنی پھیلاتے رہے اور نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ افواج پاکستان کے متعلق بھی عوام میں منفی جذبات نہ تھے ماسوائے قلات جہاں افواج کے خلاف غم و غصہ پیدا ہو چکا تھا کیونکہ خان آف قلات کے خلاف فوجی کارروائی کو ناجائز تصور کیا جاتا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۳ء میں بلوچستان کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت کو بلا جواز ختم کر کے خرابی کی بنیاد رکھی۔ عراقی سفارتخانہ سے اسلحہ ملنے کا ڈرامہ رچایا گیا۔ آزادی کے بعد پہلی دفعہ بلوچستان کے عوام کو ان کی اپنی حکومت ملی تھی لیکن اسے چلنے نہ دیا گیا۔ سردار عطاء اللہ مینگل کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر کے سرگودھا میں نظر بند کر دیا گیا۔

شہنشاہ ایران کے ایما پر بھٹو صاحب نے مینگل اور مری قبائل کے خلاف فوج کشی کی۔ نواب اکبر بگٹی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ کارروائی ۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کے خاتمہ تک جاری رہی۔ اس فوجی کارروائی نے بلوچ عوام کی زندگی اجیرن کر دی معاشی طور پر وہ پس کر رہ گئے۔ بلوچ قوم پرستی شدت اختیار کر گئی اور پاک افواج اور پنجاب کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے بعد فوجی کارروائی ختم کر دی اور گرفتار بلوچ رہنماؤں کو رہا کر دیا۔ سردار عطاء اللہ مینگل ملک چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے اور بہت طویل عرصہ لندن میں Self-Exiled زندگی گزاری۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں زیادہ عرصہ جنرل رحیم الدین خان بلوچستان کے گورنر رہے۔ ان میں بے پناہ انتظامی صلاحیتیں تھیں۔ ان کے دور میں پہلی بار بڑے پیمانہ پر کوئی ترقیاتی کام شروع ہوئے۔ دور دراز علاقوں میں بجلی کی ترسیل اور چھوٹے ڈیموں کی تعمیر پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس سے کئی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کو بجلی میسر آئی اور زراعت کو ترقی حاصل ہوئی۔ اس سے قبل بہت سے پختون علاقے مثلاً کورالائی، قلعہ سیف اللہ، کوئٹہ اور پشین بجلی کی ترسیل کے لیے نیشنل گرڈ سے منسلک کر دیے گئے۔

افغانستان پر روسی قبضہ اور جوابی امریکی کارروائی Counter offensive نے بلوچستان پر گہرے اور دوررس اثرات چھوڑے۔ کم و بیش دس لاکھ افغان مہاجرین بلوچستان کے پختون علاقوں میں قیام پذیر رہے۔ اگرچہ زیادہ تعداد مہاجر کیمپوں میں تھی لیکن بڑی تعداد میں افغان مہاجرین نے کوئٹہ پشین، لورالائی، قلعہ عبداللہ اور دیگر علاقوں میں جائیدادیں خریدیں، کاروبار شروع کیا۔ پاکستان کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے اور ووٹرز لسٹ میں اپنے ناموں کا اندراج کیا۔ امریکی حکومت آئی ایس آئی کے ذریعہ بہت بھاری رقوم مجاہدین پر خرچ کر رہی تھی۔ ان رقوم کا ایک بڑا حصہ ناجائز ہاتھوں میں جاتا رہا۔ اس سے پختون علاقوں میں مزید خوشحالی آئی۔ لیکن بلوچ اس سے خوش نہیں تھے۔ اس Demographic تبدیلی کو وہ پختونوں کے لئے فائدہ مند تصور کرتے تھے۔ ان میں احساس محرومی مزید بڑھ گیا۔

نواب اکبر بگٹی ایک سخت گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک بہت اچھے منتظم بھی ہیں۔ انہوں نے بطور گورنر بلوچستان انتظامی امور میں بہترین صلاحتیں دکھائیں۔

بلوچستان کو معاشی اعتبار سے صوبوں کے برابر لانے کی بھرپور اور سنجیدہ کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ وفاقی محاصل کی تقسیم میں آبادی کے تناسب پر رقوم کی فراہمی شروع سے ہی وفاقی حکومت کی پالیسی رہی۔ بلوچستان کی معاشی اور سماجی پس ماندگی، دور دراز کے علاقوں میں پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں، مخصوص جغرافیائی حالات کی وجہ سے ترقیاتی کاموں پر اٹھنے والے نسبتاً زیادہ اخراجات، روزگار کے محدود مواقع، وفاق کے دائرہ کار میں ملازمتوں میں بلوچستان کی برائے نام نمائندگی، مارشل لاء حکومتوں کے دوران جمہوری نظام میں تعطل، فوجی افسران کا سول معاملات میں عمل دخل، قومی اسمبلی میں بلوچستان کا کم تر وزن، ہر دور کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔

سوئی گیس پر رائلٹی اور ڈویلپمنٹ سرچارج کا فارمولا از سر نو مرتب کیا جائے کیونکہ موجودہ فارمولا انتہائی غیر منصفانہ ہے۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان کو ایک ہی شرح سے رائلٹی اور سرچارج دیا جائے۔

مثلاً ۱۵ ارب روپے کی کثیر رقم سے بلوچستان کے ایک دور افتادہ مقام سینڈک پر تانبہ نکالنے کا پروجیکٹ شروع کیا گیا۔ اس پروجیکٹ سے نہ تو مقامی آبادی کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہوئے اور نہ ہی صوبہ کی معاشی ترقی میں مدد ملی۔

گوادر پورٹ پروجیکٹ یقیناً نہ صرف بلوچستان بلکہ پورے پاکستان کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے لیکن اس کی تعمیر سے مقامی آبادی میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس اضطراب کو سنجیدگی سے دیکھنا ہوگا چونکہ مقامی آبادی میں ہنر مند لیبر اور مینجرز کی کمی ہے اس لئے ظاہر ہے ملک کے دوسرے حصوں سے بڑی تعداد میں لوگ آئیں گے۔ نیز جس طرح کراچی کے سرمایہ کار بڑے پیمانہ پر اراضی خرید کر ہاؤسنگ کالونیاں شروع کر رہے ہیں اس سے اس علاقہ میں آبادی کا تناسب (Demographic Pattern) تبدیل ہو جائے گا۔

ملک کے دوسرے علاقوں سے آنے والے ایسے افراد کو بلوچستان کے رہائشی حقوق نہیں ملنے چاہئیں۔ ماضی میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد جو ملازمت یا کاروبار کے لئے بلوچستان آئے انہیں مختصر قیام کے بعد بلوچستان کا ڈومیسائل مل جاتا تھا جس سے وہ بلوچستان میں سرکاری ملازمت کے اہل ہو جاتے تھے بلکہ وفاقی ملازمتوں میں بھی بلوچستان کے کوٹہ پر ملازمتیں حاصل کرتے رہے۔ اس سے بلوچستان کے نوجوانوں کی بہت حق تلفی ہوئی لہٰذا گوادر کے عوام کی بے چینی بلاجواز نہیں۔

اگرچہ زیر زمین معدنی وسائل آئین کی رو سے مملکت پاکستان کی ملکیت ہیں لیکن بلوچستان میں دیگر وسائل کی کمی ہے مثلاً دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں قابل کاشت زرعی اراضی بہت کم ہے لہٰذا یہاں کے عوام قدرتی گیس کو اپنا ایک قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ۱۹۸۹ء تک بلوچستان کے عوام کو سوئی گیس فراہم نہیں کی گئی نیز ۱۹۹۰ء سے قبل رائلٹی اور ڈویلپمنٹ سرچارج کی مد سے بلوچستان کو سوئی گیس کے محاصل سے بہت کم رقوم ملتی رہیں۔"

[بلوچستان اور پنجاب کے سابق چیف سیکریٹری اے زیڈ کے شیر دل کے خط کے اقتباسات جو روزنامہ جنگ کوئٹہ میں ۹ فروری اور ۱۰ فروری ۲۰۰۵ کو ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم میں شائع کیا]

صدیق بلوچ
ایڈیٹر روزنامہ آزادی
اور
ڈیلی بلوچستان ایکسپریس

بھٹو صاحب نے ۷۳ء کا آئین پاس کرایا تو ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ صاحب اور ان کے دو ساتھیوں نے اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔ نواب خیر بخش مری سمیت جینیفر موسیٰ بھی ان میں شامل تھیں۔ اس کو یہ سمجھا گیا کہ بلوچستان نے ایک طرح سے ۷۳ کے آئین کو ویٹو کر دیا ہے۔ واضح رہے اس وقت بلوچستان سے قومی اسمبلی کے کل ۱۵ ارکان تھے۔ تب لوگ پریشان ہوئے۔ اس کے بعد معاملہ تھوڑا سا اس وقت حل ہوا جب اسمبلی کے فلور پر آکر حفیظ پیرزادہ نے کہا کہ اگلے دس برس میں ہم کنکرنٹ لسٹ صوبوں کو دے دیں گے۔ لیکن آئین پاس ہونے کے بعد میوزیم میں رکھ دیا گیا۔ اور آج تک وہ میوزیم میں پڑا ہوا ہے جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے وہ اس کو استعمال کرتے ہیں ورنہ وہیں پڑا رہتا ہے۔

بنیادی طور پر پاکستان پر اسٹیبلشمنٹ کا قبضہ ہے۔ جبکہ دیگر ادارے اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر رہے۔ اٹھارہویں ترمیم پاس ہوئی تو اس پر کسی اخبار یا چینل نے تبصرہ نہیں کیا۔ ایک طرح کا بلیک آؤٹ تھا۔ لیکن اسی دن ثانیہ مرزا کی شادی تھی تو پاکستان کے ٹیلی وژن چینلز سارا دن اس کے گھر کے باہر کے مناظر دکھا رہے تھے۔ قائداعظم اور پھر لیاقت علی خان کے بعد جب غلام محمد گورنر جنرل بنا تو اس نے سازش کی اور ناظم الدین کی چھٹی کرا دی۔ اس دن کے بعد سے آج تک اقتدار پر اسٹیبلشمنٹ یعنی ملٹری اور سول بیوروکریسی کا قبضہ ہے۔ باقی یہ جتنے بھی لوگ ہیں، وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ اور ممبران قومی اسمبلی و سینیٹ میں وہ پبلک ریلیشن آفیسر ہیں اور اسٹیبلشمنٹ کے behalf پر چیزیں بیچتے رہتے ہیں۔

بلوچستان سیکوریٹی صوبہ ہے یہاں صرف سیکوریٹی والے حکمرانی کرتے ہیں یہاں اور کوئی رول نہیں کرتا۔ ہمارے سابق اسپیکر صوبائی اسمبلی معاف فرمائیں لیکن حکم نامہ کہیں اور سے آتا ہے۔ ہم نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ چیف ایگزیکٹو کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک افسر گندی زبان میں حکم دے رہے تھے کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ یہ سیکوریٹی صوبہ آج سے نہیں ہے جب سے انگریز آیا ہے اس وقت سے ہے۔ ان کو خطرہ تھا کہ روس [سوویت یونین] برٹش انڈیا پر حملہ کرے گا۔ انہوں نے آکر ادھر قبضہ کیا اور فارورڈ پالیسی چلائی۔ اس دن سے لے کر آج تک یہ سیکوریٹی ریجن ہے۔ وہ چونکہ Benevolent aggressor تھا، اس نے بلوچ main land کو تقسیم کیا۔ بعض علاقہ ایران کو، بعض افغانستان، پنجاب اور سندھ کو دے دیا۔ اور ساتھ میں جو annexed ایریا ہے اس کو اپنے ساتھ رکھا۔

اب ساری کی ساری انٹرنیشنل سیاست بلوچستان میں آگئی ہے۔ اس میں چھوٹی موٹی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب ساری سیاست آپ کے مکران کوسٹ سے ہوگی۔ مکران کوسٹ ۱۰۰۰ کلو میٹر لمبا

ہے۔اس میں سے صرف ۲۵۰ کلو میٹر ایران کے پاس ہے اور باقی کا تقریباً ۷۵۰ کلو میٹر ہمارے پاس۔اسٹریٹ آف ہرمز سے لے کر کراچی تک یہ سارا کا سارا مکران کوسٹ ہے۔ باقی سندھ کا پورشن علیحدہ ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ امریکہ نے گوادر کے آس پاس ۶۰ جنگی جہاز رکھے ہوئے ہیں۔ تین ایئر کرافٹ کیریئر میں ایک امریکہ ،ایک فرانس اور ایک برطانیہ کا ہے۔جب جنگ ہو گی تو ادھر ہو گی۔ کشمیر کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے۔

منیر بادینی صاحب تو گلگت بلتستان کے چیف سیکرٹری رہے ہیں۔آپ سب کچھ جان کر بھی جب کہتے ہیں سی پیک، تو حیرانی ہوتی ہے۔ سی پیک تو ہے ہی نہیں۔یہ تو گلگت بلتستان اور کشمیر کے علاقے سے گزر رہا ہے۔چینیوں نے کوئی بھنگ نہیں پیا ہوا کہ کسی disputed territory سے اس کو گزاریں۔ ہم لوگ جب چھوٹے سیاسی ورکر تھے اس زمانہ میں گلگت سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست شور مچاتے تھے کہ ہم پاکستان میں شامل ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارا دانش ور جو یوپی سے آیا ہوا تھا وہ کہتا کہ نہیں تم کشمیر کا حصہ ہو۔ وہ پھر کہتے کہ نہیں بھئی ہم پاکستان میں شامل ہوئے ہیں تو ہمارا دانش ور طبقہ انہیں disputed territory بنا دیتا کہ کل ووٹ ہو گا اور ہمارے ووٹ زیادہ ہوں گے تو کشمیر ہم کو ملے گا۔اب تیس چالیس سال سے ووٹ کا کوئی concept نہیں ہے۔ تو یہ کم عقلی ہے، نان سینس ہے اور کوئی سی پیک نہیں ہے۔disputed territory میں کوئی انوسٹمنٹ نہیں کرے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سی پیک کے نام پر جتنا بھی انوسٹمنٹ ہے ۴۶ بلین ڈالر کا وہ سارا کا سارا پنجاب میں ہے۔اس میں ہمارے پاس صرف ایک گوادر کا ہسپتال ہے یا ائیر پورٹ جو بن رہا ہے۔ یہ بھی سی پیک سے پہلے کا تھا۔پرویز مشرف نے اعلان کیا تھا۔اس کے بعد پیسہ نہیں ملا تو نہیں بن سکا۔ پھر چینی آئے انہوں نے پیسہ لگایا تو بولے سی پیک ہے۔ ہسپتال کو اب یہ بڑا کر رہے ہیں یہ بھی پہلے کا بنا ہوا ہے۔ لیکن اب اس کو ۵۰۰ بیڈز کر رہے ہیں۔ یہ جو انوسٹمنٹ ہے وہ سی پیک کا حصہ ہے۔

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ گورنمنٹ یعنی ریاست پاکستان بلوچستان کو ڈویلپ نہیں کرنا چاہتی اس کو پسماندہ رکھنا چاہتی ہے۔ جو ڈویلپمنٹ پراسیس ہے اس کو بھی reverse اور push کر کے بیک کرنا چاہتی ہے۔ میں کئی کئی گھنٹے تک اس پر دلائل دے سکتا ہوں۔

۱۹۶۰ میں برٹش آئے اور کہا کہ ہم آپ کو گوادر پورٹ بنا کر دیں گے لیکن انہوں نے کہا کہ ہمیں نیول بیس بنا کر دو۔ برٹش بھاگ کر چلے گئے۔اس کے بعد ہمارا پرویز مشرف آیا تھا، وہ چونکہ فوجی تھا اس لیے اس نے بڑے مزے دار انداز میں [بلکہ ادھر تو رواج ہے کہ فوج کا جرنیل جو فیصلہ کرے وہ آخری فیصلہ ہی ہوتا ہے۔ صرف اللہ جہاں بدلے باقی بس اسی پر عمل کرتے ہیں] کہا گوادر پورٹ بنے گا، بن گیا، میرانی ڈیم بنے گا بن گیا، سیندک چلے گا وہ بھی چل گیا۔ سیندک کو وزیر اعظم پاکستان اور چوہدری نثار نے آکر خود اپنے ہاتھوں سے بند کیا کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔اور یہ سب میں رپورٹ کر چکا تھا۔ جیسے ہمارے دوست نے بھی تذکرہ کیا تھا کہ اس میں ۱۲۰۰ ملازمین تھے انہوں نے اسے چلایا۔ٹرائل پروڈکشن کامیاب رہا۔ میرے خیال میں کوئی ۵۰ کروڑ کے لگ بھگ آمدنی ہوئی۔انٹرنیشنل مارکیٹ میں بھی زبردست goodwill پیدا ہوئی کہ یہ پراڈکٹ اعلیٰ ترین ہے۔اس کو چلنے دیں۔انہوں نے یہ کہا کہ آپ ہمیں بینک گارنٹی دے دیں

تاکہ بنک ہمیں پیسے دیں۔ اگر آپ گارنٹی دیں تو ہم یہ سب چلادیں گے۔ اس کے باوجود وزیر اعظم پاکستان آیا تو کہا نہیں جی۔ میں اس لیے کہتا ہوں کہ ریاست ترقی کے خلاف ہے۔ اس کے بعد چائنیز کو کہتے ہیں کہ آپ بھی نکل جائیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہمارا ۱۲ ارب کا مال پڑا ہوا ہے ہم کہاں جائیں؟ تاہم ان کو ادھر سے نکال دیا گیا۔ پھر جنرل مشرف آیا اس نے کہا تاریخ میں میرا نام ہوگا۔ نواز شریف نے سینڈک بند کیا تم چلادو، تو وہ چلنے لگا۔ کیا کسی علاقہ کو ترقی دینے کا یہ طریقہ ہوتا ہے؟

گوادر پورٹ کی گراونڈ بریکنگ تقریب کے موقع پر ہم اس وقت کے کور کمانڈر جنرل قادر سے باتیں کر رہے تھے۔ ماہی گیروں کا جلوس آیا۔ آتے ہی انہوں نے slang language میں باتیں شروع کر دیں۔ کہنے لگے اے تم جھوٹ مت بولو، تم جھوٹ بولنے آیا ہے، تم سڑک کو اورماڑہ تک بنائے گا، گوادر تک نہیں بنائے گا۔ ماہی گیروں نے بلنٹ انداز میں بات کی۔ تو اس کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ نہیں ہم ادھر سے بنائیں گے۔ اس طرح وہ اس کے براہ راست حکم سے شروع ہوا، ورنہ کبھی بھی نہ بنتا۔

بلوچستان کے حوالہ سے اسٹیبلشمنٹ کا ایک مائنڈ سیٹ ہے کہ اس کو پسماندہ رکھو۔ ۵۰ ہزار سپنڈل کی، ایک اوتھل میں اور دوسری یہاں کوئٹہ میں ملیں تھیں جو ایران نے بنائی تھیں۔ ان سے تین شفٹوں میں ۱۸۰۰۰ ملازمتیں پیدا ہوئیں۔ چلنا شروع ہوئی تو جتنا بڑا چور آفیسر تھا اس کو بٹھایا کہ لوٹ مار کرو تاکہ یہ فیل ہو جائے۔ یہ نہیں ہوا تو پھر اس کو بند کر دیا اور آخر اس کو بیچ دیا۔ ڈرامہ یہ کیا کہ فلاں یونیورسٹی کے لیے جگہ، بھئی یونیورسٹی کے لیے نئی بلڈنگ بنادیں جگہ بہت ہے۔ مل والی جگہ ہی ضروری کیوں ہے؟ ہر ایک مل جو ۵ سے ۶ بلین کی تھی ساری بیچ دیں۔ اس کی مشینری ۱۶ کروڑ میں ہمارے گورنر اویس غنی نے خریدی۔ انہوں نے ہی یہ سازش کی تھی۔ بنیادی طور پر سٹیٹ ترقی کے خلاف ہے بلوچستان کی ترقی کے خلاف ہے۔ وجہ سمجھ میں نہیں آتی، میں صحافیوں سے بھی پوچھتا ہوں کیوں خلاف ہے؟

فیڈرل حکومت کا ہر ایک پروجیکٹ ۳۰ سال میں مکمل ہوا ہے کوئی بھی ۳۰ سال سے پہلے مکمل نہیں ہوا۔ میں چیلنج کرتا ہوں۔ باقی چھوڑیں کچھی کینال ہے اس کو ۲۵ سال ہو گئے ہیں ایک فیز بھی ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ۱۰ لاکھ ایکڑ زمین آباد ہو گی اور ۱۰ لاکھ لوگوں کو روزگار ملے گا۔ گوادر ائیر پورٹ سالوں پڑا رہا۔

مسئلہ یہ ہے کہ بلوچستان ایران وافغانستان کے متوازی ایک مکمل ریاست تھی۔ ۹/۸ سو سال سے یہ تین بڑی ریاستیں موجود تھیں۔ انگریز آیا اور اس کو تقسیم کر دیا۔ اب بلوچ جہاں بیٹھا ہوا ہے اس کے پڑوس میں ہر ایک کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ سرائیکی، پٹھان، سندھی سب کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ عرب اور ایران کے ساتھ اچھے ہمسائیگی تعلقات ہیں۔ ۸۰۰، ۹۰۰ سال سے کسی کے ساتھ کوئی مثال نہیں ملتی کہ تعلقات اچھے نہ ہوئے ہوں۔ اب یہاں کچھ اوٹ پٹانگ باتیں کہی جارہی ہیں کہ پتہ نہیں کسی کے خلاف ہے اور کس کے خلاف کچھ ہے۔ یہ حقائق صاف بتاتے ہیں کہ یہ zone of peace رہا ہے مگر آنے والے دنوں میں کرائسز مکران کوسٹ پر رہے گا۔ کشمیر میں نہیں ہوگا اور نہ ہی رحیم یار خان کے بارڈر پر ہوگا بلکہ یہ یہاں رہے گا۔

ایک دفعہ ایک پریس کانفرنس میں ایک آئی جی ایف سی بیٹھے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے صوبے میں ۲۵ ملک مداخلت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بعض دوست ملک بھی اس میں شامل ہیں۔ موجودہ scenario میں تو آپ کا افغانستان اور انڈیا کے ساتھ جھگڑا تھا۔ اب اسلامی فوج کے بعد تو ایک اور فرنٹ آپ نے ایران کے ساتھ کھول دیا ہے۔ اب خواہ آپ کتنی بھی وضاحت کریں کہ ہمارا مطلب ایران کے خلاف لڑائی نہیں ہے لیکن ایران سے پوچھو وہ کیا کہتا ہے۔ متعلقہ پارٹی وہ ہے اس کا کیا opinion ہے۔ ہماری کیا بات ہے۔ ہمارا تو کچھ بھی نہیں ہے۔

بنیادی طور پر محل وقوع کی زبردست اہمیت ہے کیونکہ یہ سنٹرل ایشیا کا آئندہ گیٹ وے ہوگا۔ دنیا کی ٹریڈ یہاں سے جائے گی اور جب گوادر پورٹ بن جائے گا تو ۱۲۸ جہاز ایک ساتھ کھڑے ہوں گے۔ یہ انٹرنیشنل ٹریڈ روٹ ہے۔ آپ نے ہندوستان کا راستہ طالبان کو استعمال کر کے روکا تو انہوں نے چاہ بہار جا کر کھول دیا یعنی یہ بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ چاہ بہار ایک چھوٹا سا ٹاؤن شپ ہے۔ یہ گوادر سے بہت چھوٹا ہے اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن جاپان ایک سٹیل مل لگا رہا ہے ۲۰ لاکھ ٹن کا۔ ساؤتھ کوریا لگا رہا ہے ۱۵ لاکھ ٹن کی سٹیل مل۔ انڈیا ۲۰ ملین ڈالر کی فرٹیلائزر فیکٹری لگا رہا ہے۔ آپ کے پاس کراچی سٹیل مل صرف ایک لاکھ ٹن کا ہے۔ ایرانی سائیڈ پر آپ کو کوئی پولیس اور سیکوریٹی والا یا ڈنڈے والا نہیں ملے گا۔ یہی بلوچ وہاں پر بھی ہیں، کوئی باہر کی مخلوق نہیں ہے۔ یہاں تو ہر طرف فوج ہے، ہر کلومیٹر پر آپ سے تلاشی لی جائے گی۔ تو یہاں انوسٹمنٹ کہاں سے ہوگی انوسٹر کہاں سے آئے گا۔

۵۰ بلین ڈالر کی انوسٹمنٹ ہے ادھر اور یہاں ایک روپے کی بھی دکھا دیں۔ سوائے زمین کے لین دین کے فراڈ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ گوادر میں پینے کا پانی تک نہیں ہے۔ ابھی تک پانی کا انتظام ہی نہیں کیا گیا۔ وزیر اعظم الیکشن مہم میں گئے تو انہوں نے کہا کہ ڈیسٹلائزیشن پلانٹ لگائیں گے بھئی وہ تو پینے کا پانی ہوگا۔ یہ سارا پورٹ کس طرح چلے گا۔ اس کا انڈسٹریل ایریا اور کمرشل ایریا کہاں سے چلے گا۔ تو یہ گوادر کو ڈویلپ نہیں کرنا چاہتے۔ حکومت کی نیت ہی نہیں ہے۔ البتہ پلاٹ کا دھندہ چلتا رہے گا۔

بنیادی طور پر یہ مکران کوسٹ کی طرف گیم چینج ہو گیا ہے۔ اس میں ان کو advantage یہ ہے کہ مسقط کی آدھی آبادی اور اس کی آرمی کا ۶۰ فیصد بلوچ ہے۔ دوسری جانب یہ اسٹریٹ آف ہرمز بھی مکران کوسٹ کے اندر ہی آتا ہے۔ بلوچ بارڈر اس سے بھی ۱۰۰ میل اُدھر یعنی دوسری طرف ہے۔ یوں یہ سارا گریٹ گیم ایران اور پاکستان کے درمیان ہے۔ syria کے بعد اس کھیل نے ہماری طرف رخ کرنا ہے۔ ایسے میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی کیا پالیسی ہوگی۔ کیسے defend کریں گے۔ جبکہ سعودی عرب کی فورسز کے ساتھ اتحاد سے ایرانیوں کو offend کر دیا ہے۔ ایرانی ہمارا بارڈر insecure سمجھیں گے تو لازماً وہ اپنے طور پر حفاظتی اقدامات کریں گے۔

باقی قبائل کی تقسیم ہے۔ سی ایس پی افسران آتے ہیں اور انہیں باہم لڑاتے ہیں۔ یہ سارے لوگ anti people تھے۔ وہ سارے کے سارے منتخب حکومت کے خلاف بھی سازشیں کرتے تھے۔

امین اللہ فطرت

اسٹاف رپورٹر

روزنامہ جنگ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم، یہاں ہمارے بزرگ اور بڑے سینئر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحئ صاحب اور صدیق بلوچ صاحب کے سامنے بات کرنا میرے لیے آسان نہیں لیکن ان کی اجازت سے بات کرنا چاہوں گا۔ یہاں سرینا ہوٹل میں بیٹھ کر ہر شریک نے بلوچستان کے حالات کے حوالے سے منظر کشی کی ہے، آئین کی باتیں بھی ہوئی ہیں۔ ہر بات اہم ہے لیکن جو باتیں میرے دل پہ اثرانداز ہوئیں وہ قاضی عبدالحمید صاحب کی باتیں ہیں۔ بلوچستان کے حوالے سے ہمارے نوجوانوں کے جذبات بھی اسی طرح سے ہیں۔

بحیثیت رپورٹر میں گوادر سے ژوب تک گیا ہوں جبکہ سی پیک کے حوالے سے بھی دورہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس سرزمین کے ایک فرزند کی حیثیت سے میں نے تقریباً سب کچھ قریب سے دیکھا ہے۔ میرا احساس ہے کہ آئین اور قانون کی تو بات ہی نہیں ہے، بلوچستان کے لوگوں کے لیے ترقی اس وقت ہوگی جب امن ہوگا۔ آج یہاں سرینا ہوٹل میں ہمارے بہت سے سابق افسران نے گفتگو کی ہے لیکن شاید اس وقت ان کو یہ باتیں یاد نہیں ہوتیں جب وہ عہدوں پر ہوتے ہیں۔ یہی سوال پارلیمنٹ ممبران سے بھی متعلق ہے کہ پارلیمنٹ میں وہ خاموش ہوتے ہیں اور باہر آکر باتیں کرتے ہیں۔ بلوچستان کے حالات کے بارے میں صدیق بلوچ صاحب نے درست کہا کہ یہ ایک سیکوریٹی صوبہ ہے۔ درحقیقت سی پیک کے حوالے سے بھی فیصلے سیکورٹی والے کرتے ہیں۔

سی پیک کی ناکامی کے حوالے سے بھی بات ہوتی ہے، میں نے اپنے طور پر روزنامہ جنگ میں لکھا تھا کہ میرے خیال میں امریکہ سی پیک کو کبھی بھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ دوسری جانب ہندوستان بھی اس کے ساتھ مل کر ایسا ہی کرے گا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس امریکہ نے روس کو گوادر سے روکنے کے لیے ۳۰ سال لڑائی کی، لاکھوں افغانوں کا خون بہایا، ہمیں بھی اور ہمارے بلوچ اور پشتون بھائیوں کو بھی دربدر کیا۔ وہ کس طرح خوشی سے چین جیسے ملک کو آسانی سے گوادر تک جانے دے گا۔ اگر سپر پاور روس کو اس نے ناکام کیا تو میرے خیال میں ان کے سامنے چین کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے سیاست دان بلوچستان کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ بلکہ سیاست دان ہی نہیں یہاں کے بیوروکریٹ بھی بلوچستان کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ بلوچستان کا نام استعمال کرتے ہیں، اس وقت وہ بلوچ اور پشتون بن جاتے ہیں لیکن کرسی یا عہدے پر آنے کے بعد بلوچستان کو اہمیت نہیں دیتے۔

اگلی بات سیکورٹی کے نام پر کیے جانے والے مظالم ہیں۔ بلوچ تنظیموں کے مطابق یہاں کے لوگوں نے ہزاروں لاشیں اٹھائی ہیں۔ ان مرنے والے لوگوں کی ماؤں اور بہنوں کو جواب کون دے گا؟ ان لوگوں کا سی پیک کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا تعلق ہے۔ جن لوگوں کے دو دو بیٹوں کی لاشیں ملی ہیں وہ کیسے خوش ہوں گے کہ بلوچستان میں سی پیک آجائے گا جہاں تک آئین اور قانون کی بات ہے سیکورٹی کے نام پر اس کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ تلخ بات پر معذرت خواہ ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سے لوگوں کے ساتھ زور زبردستی کی گئی ہے اس کے بعد ہمارے لوگوں کو نوکری نہیں بلکہ امن کی تلاش ہے۔ یہ اپنے سر کی امان چاہتے ہیں، انہیں سی پیک کی ایک اینٹ کی تلاش بھی نہیں ہے۔ بہت سے علاقوں میں ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ لوگوں کو اپنی خواتین مریضوں اور بزرگوں کو ہسپتال لانے لے جانے کے لیے بھی کئی کئی چیک پوسٹوں پر رکنا پڑتا ہے۔ ایمرجنسی بھی ہو تو ۲۰ منٹ کا فاصلہ چیک پوسٹوں سے ہوتے ہوئے ایک گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے لوگ ان حالات سے تنگ ہیں۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ باہر کے ملک مداخلت کر رہے ہیں۔ یقیناً کر رہے ہوں گے۔ ان حالات کو دیکھ کر وہ ہمارے جذبات سے فائدہ تو اٹھائیں گے۔ ایسے میں ہمارے لوگ سی پیک کو بھول کر ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملا کر کہیں گے کہ جب ہماری مریض والدہ کی عزت نہ ہو گی تو ہمیں سی پیک کی کیا ضرورت ہے۔

ابھی کچھ عرصہ قبل مجھے حبکو منصوبے کے افتتاح میں رپورٹنگ کے لیے شرکت کا موقع ملا۔ چینی سفیر وہاں تھا، حبکو کا ڈائریکٹر تھا جو بلوچستان سے نہیں تھا، احسن اقبال صاحب تھے ظاہر ہے وہ بھی بلوچستان سے نہیں، چیف سیکرٹری بلوچستان تھے لیکن ان کا تعلق بھی بلوچستان سے نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ۴۰ کے قریب چائینیز تھے لیکن بلوچستان سے چند مقامی لوگوں کے علاوہ کوئی نمایاں آدمی نہیں تھا۔ اگر صورت حال یہ ہو تو امریکہ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ امریکہ ہی نہیں، ہندوستان اور ایران بھی فائدہ اٹھائے گا۔ آپ ہی بتائیں کہ جب اتنے زیادہ مظالم ہوں تو پھر کیا ہو گا؟

یعنی اگر آپ سرینا سے نکل کر بلوچستان کے حالات کا صحیح طور پر جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ مقامی لوگوں کے لیے نہ سی پیک ہے اور نہ امن۔ ایسے میں جنگ تو ہو گی اور ہماری سرزمین پر ہو گی۔ چنانچہ ہم لوگ پھر سے تباہ ہوں گے۔ یہ بات شاید کہنے میں مشکل ہو گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ سی پیک ہمارے نام پر آیا اور ہمارے ہی نوجوانوں کا خون بہایا گیا ہے۔

غربت کے باوجود ماں باپ قربانیاں دے کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ لیکن اگر ۱۶ سال پڑھانے کے بعد انہیں ایم اے پاس نوجوان بیٹے کی لاش کی بھی ڈی این اے کے ذریعہ شناخت کرانی پڑے تو کیسے توقع کی جاتی ہے کہ اس کا بھائی پڑھنے میں دلچسپی لے گا۔ اس پورے خاندان کے لیے سی پیک کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

عبدالرؤف مینگل

سابق ایم این اے

بلوچستان نیشنل پارٹی

(مینگل)

بسم اللہ، میں معذرت چاہتا ہوں کہ لیٹ ہونے کی بناء پر پہلے سیشن میں ہونے والی گفتگو نہیں سن سکا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسائل نئے نہیں ہیں بلکہ شروع دن سے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے آئین کا دن منایا جارہا تھا۔ اس موقع پر بلوچستان ایکسپریس کے ایڈیٹوریل میں صدیق صاحب نے ذکر کیا کہ جس وقت آئین بنایا گیا تو ڈاکٹر عبدالحئی صاحب [جو یہاں بھی موجود ہیں] ان سمیت ۳ لوگوں نے احتجاجی طور پر اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔ ظاہر ہے ان کی بات نہ سنی گئی۔ لیکن اس ملک کی ۷۰ سالہ تاریخ میں آئین کے ساتھ جو ظلم کیا گیا اس کا کم ہی کوئی ذکر ہوتا ہے۔ یہ ظلم ہر دور میں ہوا ہے، چاہے وہ صدر ایوب خان کا دور ہو یا یحییٰ خان، ضیاء الحق اور یا پھر آمر پرویز مشرف کا دور ہو۔ بدقسمتی اس ملک کی ہے، ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس کے باوجود ان کے ساتھ ہیں کہ نہ ہماری سفارشات پر عمل درآمد ہوتا ہے، نہ ہمیں سنا جاتا ہے، اور نہ ہی ہمیں اس ملک کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ میں خود بھی پارلیمنٹ کا حصہ رہا ہوں اور مجھ سے سینئر دوست بھی یہاں بیٹھے ہیں جو پارلیمنٹ کا حصہ رہے ہیں۔ کیا اس پارلیمنٹ کے فیصلوں پر عمل درآمد ہوتا ہے؟ صوبائی اسمبلی کے سابق اسپیکر بھوتانی صاحب بھی بیٹھے ہیں۔ معذرت کے ساتھ دریافت کرتا ہوں کہ یہاں صوبائی اسمبلی میں جتنے فیصلے کیے گئے کیا ان پر عمل درآمد ہوتا ہے؟ اور یہ بھی ہم سب ہی جانتے ہیں کہ کتنی ترامیم جبراً لائی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں اسمبلی کا ریکارڈ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

سی پیک کے حوالے سے پنجاب، فیڈرل حکومت اور اسلام آباد کے دانشور جان بوجھ کر یہ تاثر پیش کررہے ہیں کہ بلوچستان کے لوگ ترقی اور تعلیم نہیں چاہتے۔ لیکن میرا سوال ہے کہ جب آپ بندوق کے زور پر سوئی میں چھاؤنی بنا سکتے ہیں تو کیا اسی بندوق کے زور پر ڈیرہ بگٹی یا سوئی میں کوئی یونیورسٹی نہیں بنا سکتے؟ جس طرح سیکوریٹی سٹیٹ کی بات ہوئی اور بعض دوستوں نے ''سیکوریٹی پراونس'' بھی کہا تو یہ ایک حقیقت ہے کہ معذرت کے ساتھ، صوبہ کو اس کی اسمبلی نہیں چلا رہی، نہ ہی یہاں کے چیف ایگزیکٹو اس کو چلا رہے ہیں۔

اخبارات اٹھا کر دیکھیں فیتے کون کاٹ رہا ہے؟ چیف ایگزیکٹو تو منشی کی طرح کام پر کھڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جن لوگوں کو اپنی مرضی سے جعلی بیلٹ پیپرز کے ذریعے لائیں گے ان سے نہ بلوچستان کی تقدیر بدلے گی، نہ بلوچستان کی ترقی کا فیصلہ ہوگا اور نہ یہاں کا کوئی مسئلہ حل ہوگا۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی وژن ہے اور نہ ہی درد۔ آپ بلوچستان کی تمام تر صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے وہ کام کریں جو آنے والے دنوں میں بلوچستان کی خوشحالی اور ترقی کا ضامن ہو۔

میں دو چیزیں آپ کے سامنے رکھوں گا کہ جب بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد اقتدار پی پی پی کے حوالے کیا گیا تو زرداری صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ''بلوچستان کے معاملات سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ بڑے مسائل اور مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ میرے آنے کے بعد کچھ تشفی ہو گی اور کچھ چیزیں حل ہوں گی''۔ پھر جب وہ صدر بننے جا رہے تھے تو پھر اپنی پارٹی کی طرف سے ان سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت انہوں نے کہا ''مائنس بلوچستان''۔ یعنی کہ جو گورنمنٹ آپ کو دیتے ہیں وہ مائنس بلوچستان ہے۔ پھر جب میاں نواز شریف کی حکومت آئی تو وزیر داخلہ نے پنجاب ہاؤس میں ہمیں لنچ پر بلایا۔ میں، ہماری پارٹی کے صدر اختر مینگل صاحب، ساجد ترین صاحب اور ڈاکٹر جہانزیب جمالدینی شریک تھے۔ بلوچستان کے معاملات پر بات چیت کی گئی۔ میں نے ان سے یہی بات دہرائی کہ اس وقت زرداری صاحب نے تو یہ بات کی تھی۔ ابھی آپ نئے نئے آئے ہیں تو کیا ہم آپ سے بھی یہی توقع کریں کہ ''مائنس بلوچستان''۔ تو وہ کہنے لگے، ''نہیں اللہ نہ کرے ایسا کچھ بھی نہیں ہے''۔ لیکن پھر آج چار سال ہونے کو ہیں اسی طرح ہو رہا ہے۔ صورت حال میں تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اسی طرح مسخ شدہ لاشیں مل رہی ہیں اور اسی طرح چادر اور چار دیواری کی پامالی بھی ہو رہی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا پر پابندی ہے۔ بلوچستان کو انہوں نے بالکل بلیک اینڈ وائٹ کر کے اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔

ہمارے یہاں ویسٹ کی جمہوریت کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن وہاں پر پورٹس صوبوں یا اسٹیٹس کے اختیار میں ہیں جبکہ یہاں پر گوادر پورٹ پر اختیارات کے حوالے سے صوبائی اسمبلی سے ریزولیوشن متفقہ طور پر پاس بھی ہوئی لیکن آج تک اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ سی پیک کے معاملے پر اسلام آباد میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی۔ تمام پارٹیوں کو اسلام آباد بلا کر پروجیکٹر پر ایک ایک کر کے تمام نکات پر بات ہوئی تمام سیاسی جماعتوں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ پلاننگ کے وفاقی وزیر احسن اقبال بھی موجود تھے۔ وہاں پر تمام چیزیں بلوچستان کی طرف سے دلیل کی بنیاد پر اور حقائق اور اعداد و شمار کے ساتھ سمجھائی گئیں۔ سب نے ریزولیوشن پر دستخط بھی کر دیے۔ لیکن آج تک اس پر عمل درآمد کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔

آج کے سیمینار پر بھی میں آپ سے اپنی اور پارٹی کی جانب سے اظہار تشکر کرتا ہوں۔ مگر ایک سیمینار آپ گوادر جا کر بھی کریں تو جو باتیں ہم یہاں کر رہے ہیں وہ وہاں آپ کو دیکھنے کو ملیں گی۔ گوادر آج بھی ایک چھوٹی سی آبادی یا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پورے ڈسٹرکٹ کی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے اور اس میں گوادر کی آبادی کوئی ۵۰ ہزار ہو گی۔ اب موجودہ مردم شماری کے حوالے سے [افغان مہاجرین کے بارے میں] گرینڈ جرگہ کی سفارشات اور ہائی کورٹ کے فیصلے، دونوں پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ کیا کہیں دنیا میں ایسا دیکھا جا سکتا ہے کہ غیر ملکیوں کو ووٹ کا حق دیا جائے یا اس کو شہری بنا دیا جائے؟ کہیں بھی نہیں۔ ویسٹ میں بھی شاید تب ہوا ہے جب کسی نے سٹیزن شپ لے لی ہو۔ اس حوالے سے UNHCR اور اقوام متحدہ کے بھی قوانین ہیں، یہ تو ان کے بھی violators ہیں۔ انٹرنیشنل رولز کے تحت کس نے اجازت دی ہے کہ آپ افغان مہاجرین کو لیں۔ میں صرف افغان مہاجرین کی نہیں بلکہ تمام غیر ملکیوں کی بات کر رہا ہوں۔ جو بھی غیر ملکی ہے وہ یہاں کا شہری نہیں بن سکتا۔

بلوچستان ایک چھوٹی سی آبادی ہے جو پہلے سے جنگ زدہ ہے۔ یہاں اب پانچواں فوجی آپریشن ہو رہا ہے اور اس so called جمہوریت کے اندر بھی یہ ہو رہا ہے۔ دوسری جانب بد قسمتی سے یہاں کوئی اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں۔ ۱۸ اگست ۲۰۱۶ کا واقعہ ہوتا ہے جس میں بلوچستان کے نوجوانوں اور سپوتوں کو دن دھاڑے ایک منصوبے کے تحت شہید کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی کسی کا بھائی بیٹھا ہوا ہو گا، کسی کا دوست ہو گا۔ کوئی قریبی عزیز ہو گا۔ پھر جب اس سانحے پر کمیشن بنتا ہے اور فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ سامنے آجاتی ہے جس میں صوبائی حکومت اور وفاقی حکومت کی نااہلی سامنے آتی ہے۔ بجائے اپنی نااہلی کو تسلیم کرنے کے، ان کو تو کوئی پشیمانی تک نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے کمیشن کے فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

اب ہمارے ساتھ، ہمارے مستقبل کے ساتھ، ہمارے عدلیہ کے فیصلوں کے ساتھ اس طرح کا عمل کیا جائے تو کیا یہ ٹھیک ہے؟ بلوچستان چاہے اسٹون ایج میں بھی ہو لیکن آج انٹرنیٹ کا دور ہے، سوشل میڈیا کا دور ہے، کہیں نہ کہیں سے باتیں لوگوں تک پہنچتی ہیں۔ پہاڑوں میں بھی بیٹھے ہوں یا جنگلوں میں ہوں کہیں نہ کہیں بی بی سی یا وائس آف امریکہ تو سنتے ہیں۔ اب جب اس طرح کا رویہ اور مائنڈ سیٹ ہو گا اور وفاقی حکومت اور اسلام آباد کی اسٹیبلشمنٹ بلوچستان کے نہتے لوگوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرے گی تو پھر اس کا ردعمل تو فطری ہے خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو۔ آج بھی لوگ لاپتہ ہیں۔ چاہے اس سے پہلے کی ڈھائی سال کی گورنمنٹ ہو یا آج کی منشیوں کی گورنمنٹ ہو، کیا ان کے ورثاء کو، ان کے والدین کو، ان کی ماؤں کو، ان کے بوڑھے بزرگوں کو یہ تشفی دے سکتے ہیں کہ تمہارا بچہ کدھر ہے؟ انہیں کم از کم قبر تو دکھا دیں۔ جب خضدار میں توتک کے علاقے میں اجتماعی قبر دریافت ہوتی ہے اور ۳۰۰ کے قریب لاشیں ملتی ہیں تو کمیشن بنتا ہے اور اس کمیشن کو ہمارے موجودہ چیف جسٹس ہیڈ کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی نظروں سے دیکھا تھا ان سب نے ایک ایک کر کے اپنے بیانات ریکارڈ کرائے۔ آج تک اس کا فیصلہ ہمارے اس جمہوری دور میں نہ پہلے ڈھائی سال میں لایا گیا، نہ اب امید ہے اور نہ آئندہ امکان ہے کہ یہ کسی رپورٹ کو شائع کریں گے۔

میں معذرت خواہ ہوں۔ کھانے کا وقت بھی ہو رہا ہے لیکن گزارش یہ ہے کہ ہم جمہوری لوگ ہیں، ہم ترقی چاہتے ہیں، اپنے حقوق اور اس سے بڑھ کر اپنا تحفظ چاہتے ہیں۔ اس صوبے میں اپنے گھر کے اندر بھی ہمیں تحفظ نہیں ہے۔ آج بھی آپ کی دعوت پر ہم دوست کہاں کہاں سے سفر کر کے آئے ہیں لیکن معلوم نہیں کہ یہاں سے اٹھ کر جائیں تو اپنے گھروں کو صحیح سلامت پہنچیں گے یا نہیں۔

کوئٹہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ چوہدری نثار آئے تھے تو انہوں نے کہا کہ یہ چار گلیوں کا شہر ہے۔ اب جب چار گلیوں کا شہر ہے تو آپ سے سنبھالا کیوں نہیں جاتا؟ ۳۵ ارب روپے ہم لاء اینڈ آرڈر پر صرف ایف سی کو دیتے ہیں۔ کیا وہ ہمارا تحفظ کریں گے؟ اس کے بعد آپ اخبارات دیکھیں کہ کیا چیزیں رپورٹ ہو رہی ہیں؟ میڈیا پر پابندی ہے، بین الاقوامی ممالک کے سفیر جو اسلام آباد کے اندر بیٹھے ہیں ان سب پر پابندی ہے وہ یہاں بلوچستان نہیں آسکتے۔ باہر کا جرنلسٹ یہاں نہیں آسکتا۔ ہیومن رائٹس وائلیشن پر جو لوگ کام کر رہے ہیں وہ یہاں نہیں آسکتے۔ جب آپ میڈیا کو بند رکھیں گے اور بین الاقوامی تنظیمیں جو انسانی حقوق پر کام کر رہی ہیں ان کو بھی بند رکھیں گے، تھریٹ کریں گے ان کو فون بھی

جائے گا ان کے اداروں کو بھی فون جائے گا کہ بلوچستان نو گو ایریا ہے۔ جب آپ بلوچستان کو نو گو ایریا بتائیں گے تو یہاں پر کیا ردعمل ہو گا۔ ٹھیک ہے آپ لوگوں کا یہ سیمینار کامیاب ہونے جا رہا ہے۔ لیکن اس چھتری کے نیچے بے شمار سیمینار ہوئے ہیں، بے مقصد بھی ہوئے اور بامقصد کم ہی ہوئے ہیں۔ لیکن آپ اس سیمینار کو بامقصد بنائیں۔ یہ سیاسی جماعتوں اور سوشل لوگوں غرض تمام لوگوں کے grievances ہیں۔

میرے بھائی نے یہاں بہت اچھی بات کی کہ اس سی پیک سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں جس سے میرا سر سلامت نہ ہو، میری جان سلامت نہ ہو، میرا گھر سلامت نہ ہو۔ میری ماؤں بہنوں کی چادر اور چار دیواری محفوظ نہ ہو۔ میں سی پیک چاہتا ہوں تو بلوچستان کے لیے چاہتا ہوں۔ ترقی کے لیے تو میرا جھگڑا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحئی نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر کیوں دستخط نہیں کیے تھے یقیناً ان کے کچھ تحفظات تھے۔ ان تحفظات میں سے کچھ ۱۸ویں ترمیم میں خیراتی طور پر مل گئے لیکن اس پر بھی وفاقی حکومت پشیمان ہے کہ کسی طرح اس کو تھوڑا بہت واپس مل جائے۔

اسلم بھوتانی صاحب کو میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ اسپیکر اور پارلیمنٹ کا ممبر ہوتے ہوئے جب ان کے حلقے میں کنڈ ملیر کا جو علاقہ ہے وہاں پر فیڈرل گورنمنٹ نے کوڑیوں کے دام زمین الاٹ کرائی لیکن انہوں نے وہ واپس کرا دی تھی۔ دیکھیں گورنمنٹ میں ہونے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آنکھیں بند کر لو۔ انہوں نے سیاسی احتجاج کیا، پارلیمنٹ کے اندر بھی احتجاج کیا اور پھر ہائی کورٹ سے لے کر سپریم کورٹ تک احتجاج کیا۔ انہوں نے وہ آرڈر واپس کرائے اور پھر اس الاٹمنٹ کو منسوخ بھی کرایا۔ اب سننے میں آیا ہے کہ ہمارے so called جمہوری لوگوں نے دوبارہ ان کو آرڈر دیا ہے۔ اب گوادر کو غنیمت سمجھ کر لوگوں کی زمینیں بانٹ رہے ہیں۔ یہ زمینیں قبائلیوں کی ہیں اور یہ ان کی سیٹلمنٹ طاقت کے زور پر کر رہے ہیں۔ اپنے کچھ ٹاؤٹس رکھے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ یہ کام کروا رہے ہیں۔ اب کل کے دن قبائلیوں کی زمینوں پر جھگڑے سامنے آجائیں گے۔ یہاں سے بیٹھ کر وہ جو ماشاءاللہ وائٹ کالر والے ہیں آپس میں زمینیں تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو لوگ وہاں کے ہیں، کم از کم جن کی زمین یا جن کا موضع ہے، جن کی کھتونی ہے، جن کے نمبرز آتے ہیں زمین ان کے نام پر تو کر دیں۔ لیکن یہ ان سے نہیں ہو پا رہا ہے۔

کرپشن اس نہج تک پہنچ چکی ہے کہ تمام اداروں میں ہے اور ایک سیاسی ورکر کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ پارٹیوں کے اندر بھی رواج بن گئی ہے۔ اور کرپشن پر کسی کو ندامت بھی نہیں ہو رہی ہے وہ اسے شیر مادر سمجھتے ہیں اور دوسرے دن یہاں پر سینہ تان کر چل رہے ہوتے ہیں۔ وہ پیسے جو اٹھارہویں ترمیم کے ساتھ ملے ہیں اگر ایمان داری کے ساتھ خرچ ہو جائیں تو بہت سارے مسائل میں کمی آسکتی ہے اور جب پیسے lapse ہوتے ہیں اس سے بڑھ کر اب گُڈ گورننس کی نفی کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہ آپ کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پچھلے ادوار میں بھی یہاں سے پیسے lapse ہوئے ہیں اور اس بار بھی ۳۵ء۳۰ ارب روپے کے قریب lapse ہوئے۔ جبکہ یہاں پر لوگوں کو پینے کے صاف پانی تک دستیاب نہیں ہے۔

آخر میں conclude کرتا ہوں کہ نصیر آباد کا ڈسٹرکٹ جو کہ زرعی علاقہ ہے اور ایک ڈویژنل ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ اس کو ایسٹرن بلوچستان کہتے ہیں اور اس کا بارڈر خان گڑھ جیکب آباد سندھ کے ساتھ لگتا ہے۔ اس وقت یہ آپ کے نیشنل ہیلتھ پروگرام کی رپورٹ ہے کہ یہ پوری دنیا میں ہیپاٹائٹس اے بی اور سی کے حوالے سے سب سے زیادہ effected علاقہ ہے۔ اور بجٹ کے پیسے یہاں lapse ہو رہے ہیں۔ ان کو کچھ نہیں چاہیے صرف ان کو صاف پانی چاہیے۔ اوپر سے جو آلودہ پانی نہروں کا آرہا ہوتا ہے وہ اسی پانی کو زراعت کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہی پانی گھر کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہی پیتے بھی ہیں جس کی وجہ سے یہ مرض لاحق ہے اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ آخر میں آپ سب کا بہت شکریہ

بلوچستان کسی ملا اور غیر ملا یا اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس ملک میں دوسرے بہت سارے مظلوموں کی طرح اسلام بھی مظلوم ہے۔

کہتے ہیں اقوام پر زوال آنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اندرونی خرابیوں کا تذکرہ کرنے اور ان کا جائزہ لینے کے بجائے بیرونی مداخلتوں کا ذکر کر کے مطمئن ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ زوال سے نہیں نکلتیں۔ ہم مذہبی حوالے سے جب بات کرتے ہیں تو سیکولر ساتھی یہی کہتے ہیں کہ آپ ہر چیز میں کہتے ہیں اسرائیل کی سازش ہے، امریکہ کی سازش ہے، بھارت کی سازش ہے، یہ نہیں دیکھتے کہ ملک کے اندر بھی بہت کچھ چل رہا ہے۔ اسی طرح بلوچستان اور اس کے مسائل کے معاملے میں بھی ہم ہمیشہ اسی طرح بیرونی عوامل کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بیرونی عوامل پر بحث میں بہت سا وقت صرف کیا جاتا ہے۔

ہدایت الرحمٰن بلوچ

سیکرٹری جنرل

جماعتِ اسلامی بلوچستان

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں بیرونی مداخلتیں بھی ہیں لیکن یہ اگر ۱۰۰ میں سے ۸۰ یا ۶۰ فیصد بھی ہو تو تسلیم کرنا چاہیے کہ کوئی ۲۰ یا ۴۰ فیصد میرا اور آپ کا اپنا قصور بھی ہو گا۔ بہت سی خرابیوں میں میرا اور آپ کا کندھا استعمال ہوا ہو گا۔ درحقیقت بلوچستان میں ۱۹۴۸ کے آپریشن سے لے کر اگلے ہر آپریشن میں کسی نہ کسی بلوچ کے کندھے بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً کیا جب اکبر بگٹی شہید ہوئے تو بلوچستان حکومت میں شامل بلوچوں میں سے کسی ایک نے بھی استعفیٰ دیا؟ بعد میں جب حکومت چلی گئی تو سب واویلا کرتے رہے کہ وہ شہید ہے۔ صوبائی بیوروکریسی میں بھی اس صوبے اور سرزمین سے محبت کرنے والے بہت سے بلوچ تھے۔ اس بیوروکریسی میں سے کسی ایک افسر نے بھی استعفیٰ دیا؟ کیا کوئی ایک بھی مثال ہے؟

قومی اسمبلی میں بلوچستان کے ۱۷ نمائندے ہیں سینیٹ میں ۲۲ ہیں۔ ان ۳۹ نمائندوں میں سے ایک نے بھی کسی سنجیدہ ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ اسی طرح صوبائی اسمبلی میں ۶۵ ممبران اور صوبائی بیوروکریسی کے بہت سے لوگ ہیں جو کم از کم اس وقت کوئی ردعمل دینے سے معذور رہے۔ اب اپنی اپنی پوزیشن کھونے یا چھوڑنے کے بعد سچ بولا بھی جائے تو اس کا کیا فائدہ ہے۔ درحقیقت سچ بات بھی اپنے وقت پر ہی اثرانداز ہوتی ہے اور اسی وقت اچھی بھی لگتی ہے۔

[عبدالروف مینگل: میں نے اور ہماری پارٹی کے اراکین نے اسمبلیوں سے استعفے دیے تھے]

لیکن اکبر بگٹی کا داماد شاہد بگٹی تو آخر وقت یعنی اپنی ریٹائرمنٹ تک سینٹ میں موجود رہا۔ اس نے بھی استعفیٰ نہیں دیا۔

اکبر بگٹی کے قتل کے بعد ایک جرگہ میں بلوچستان کے تمام سردار اور معتبرین ایک جگہ اکٹھے بھی ہوئے تھے۔ وہاں تمام لوگ اکٹھے ہوئے وہاں عالمی عدالت کے ذکر کے علاوہ اور بھی بہت سے دعوے کیے گئے کہ ہم یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ لیکن جب ان میں سے آدھے لوگ کابینہ کا حصہ ہو گئے تو عالمی عدالت کو بھی بھول گئے، بگٹی صاحب کو اور ان کے مقدمہ کو بھی بھول گئے۔ اب کوئی نام بھی نہیں لیتا کہ کوئی جرگہ ہوا تھا، حالانکہ اس وقت بلوچستان کی تمام اعلیٰ قیادت اور سردار ان وہاں موجود تھے۔

گوادر کے ایم پی اے کا تعلق پہلے ق لیگ سے تھا اب اس کا تعلق بی این پی مینگل سے ہے۔ وہاں کی لاکھوں ایکڑ کی زمین کا اب اسی ایم پی اے کے نام پر اضافہ ہو رہا ہے۔ میں گوادر سے تعلق رکھتا ہوں، ماہی گیر کا بیٹا ہوں لیکن میرے پاس ۱۰۰ گز زمین بھی نہیں ہے۔ جبکہ گوادر ایسا علاقہ ہے کہ وہاں ڈیرہ بگٹی، جعفر آباد وغیرہ کی طرح کوئی بڑا جاگیر دار یا کوئی سردار نہیں ہے کیونکہ وہ سرداری علاقہ نہیں ہے۔ اسی لیے وہاں ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی فرد کے پاس پہلے سے لاکھوں ایکڑ زمین ہو۔ لیکن ہمارا وہاں کا جو ساتھی ایم پی اے ہے اس کے پاس موجود ہے۔

> بلوچستان کا سب سے بڑا مسئلہ کرپشن اور سرکاری سطح پر لوٹ مار ہے۔ صوبائی اسمبلی کے ۶۵، قومی اسمبلی کے ۱۷ اور سینیٹ کے ۲۲ ارکان بلوچستان سے ہیں۔ صوبائی حکومت کی بیوروکریسی میں بھی اکثر لوگ مقامی ہیں۔ یہی لوگ اپنے مفادات کے لیے حکومتوں سے سودے بازیاں کر کے ان کو استحصال کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ الیکشن بھی ان لوگوں نے پیسے کا کھیل بنایا ہوا ہے۔

دوسری جانب میں خود پہلے پی ایم ایل ق میں تھا اور اس بات کا ذاتی طور پر گواہ ہوں کہ جب وہاں کے نوجوانوں کو لاپتہ کر کے مارا گیا تو میرے اصرار کے باوجود ہمارے اس ایم پی اے نے مقتول کے والد کو تسلی دینے کے لیے اس کے پاس جانے سے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ ''واجہ کار ناراض باں'' [بلوچی سے ترجمہ: جناب ناراض ہوں گے]۔ سوال یہ ہے کہ بلوچستان کے ۶۵ ارکانِ اسمبلی اگر وہاں کے ایک مظلوم والد کو جا کر تسلی نہیں دے سکتے۔ تو ریکوڈک اور سوئی گیس یا سیندک پر کیا لڑائی کریں گے۔ ایسے لوگ میرے جیسے عام بلوچ کے حقوق کے لئے کیا جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے بلوچستان کے مسائل کے لیے میں کسی اور کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا، اپنے آپ کو ہی ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ سرفہرست اگر کوئی اور بھی ذمہ دار قرار پائے تو دوسرے اور تیسرے نمبر پر تو میں ہی ہوں، میں نہ ہوں گا میرا بھائی یا کوئی اور رشتہ دار ہو گا، میرا وزیر اور میرا اسیکریٹری ہو گا۔ یوں بلوچستان کے مسائل کے ذمہ دار ہم خود بھی ہیں۔ ابھی ایک تازہ مثال وزیر اعلیٰ کی طرف سے سی پیک پروگرام کی ہے۔ اس حوالہ سے ایک صحافی دوست نے بتایا کہ وزیر اعلیٰ صاحب نے کہا کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ لے لو باقی شور نہیں کرو۔ اگر یوں ہی ہونا ہے تو ہمارے اپنے وزیروں کا آخر کام کیا ہے۔

بلوچستان کا ایک اور بڑا مسئلہ کرپشن ہے۔ تعلیم، صحت، گلیاں، بازار، روزگار سب کچھ تباہ ہو رہا ہے۔ بڑی تعداد میں ٹارگٹ کلنگ ہوئی ہے۔ اس کے پس منظر میں کرپشن ایک اہم عنصر ہے۔ ہمارے ہاں پانی نہیں ہے لیکن پانی کی ٹینکیوں سے پیسے بر آمد ہوتے ہیں۔ یہاں ۸۰/۷۰ فیصد کرپشن ہے اور اسی لیے تمام ادارے تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ کرپشن کے الزام میں گرفتار صاحب جب جیل سے رہا ہوتے ہیں تو وکٹری کا نشان بناتے ہیں کہ میں نے بلوچ قوم کے لیے جیل کاٹی ہے۔ شرم سے ہماری آنکھیں جھک جاتی ہیں کہ کس مقصد سے جیل میں گئے تھے اور وکٹری کے نشان لے کر نکل رہے ہیں۔ کیس چل رہے ہوتے ہیں کہ کرپشن کے پیسے کہاں ہیں۔ اور عدالت کے سامنے میڈیا سے ایسے گفتگو کر رہے ہوتے ہیں جیسے انہی لوگوں نے قائدِ اعظم کے ساتھ مل کر پاکستان بنایا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بلوچستان کی تباہی کے ذمہ دار کوئی اور نہیں، ہم خود ہیں۔ یہاں کے منتخب نمائندے ہوں، دیگر سیاسی قیادت ہو یا بیوروکریسی، سب ہی نے اس سرزمین کے لوگوں کی سودے بازی کی ہے۔ اگر بلوچستان کے ۶۵ ارکانِ اسمبلی اکٹھے ہو جائیں تو پاکستان کیا امریکہ کی فوج بھی ہمارے مسائل کو حل ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اگر میں اور آپ متفق ہو جائیں تو کسی آدمی کی جرأت نہیں ہو گی کہ میرا سینڈک، میرا سونا، میری زمین اور میرے وسائل کو چھین کر لے جائے۔ بس ہمارے لیڈر یہاں کی بہادر قوم کے لیڈر بنیں، سودے بازیاں نہ کریں کہ کرسی میں ہوں تو سب اچھا ہے، اور کرسی سے نکلیں تو سب خراب ہے۔

پروفیسر منظور بلوچ
لیکچرار
بلوچستان یونیورسٹی

شکریہ! میرے لیے سینئر حضرات کی موجودگی میں بات کرنا مشکل ہے بالخصوص جب بات سی پیک اور بلوچستان کی ہو رہی ہو تو یہ خدشہ رہتا ہے کہ بہت ساری چیزیں آپس میں گڈ مڈ ہو جائیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمیں بولنے کی اجازت نہیں ہے اور جب بولنے کا کوئی موقع ملتا ہے تو اس میں ہم اپنے زخم ہی پھوڑتے ہیں شاید اس لیے کہ ہمیں زخموں کے علاوہ اور ملا بھی کیا ہے۔ ہمارے گھروں میں آج بھی ہمارے بھائی لاپتہ ہیں۔ بچے دیکھتے ہیں کہ کل تک ان کے چچا، ماموں، بڑے بھائی ان کے ساتھ تھے اور پھر اچانک غائب ہو گئے۔ ان کی یاد اور غم میں لمبی جدائی ہوتی ہے۔ سالوں تک پتہ نہیں چلتا یا اس وقت پتہ چلتا ہے جب ان کی لاشیں آتی ہیں۔

میرا اپنا بھانجا سوا سال پہلے غائب کر دیا گیا ہے۔ بی ایس سی کا سٹوڈنٹ تھا۔ اس کی والدہ نے ایک دن مجھ سے کہا کہ میں اپنے بچے کے لئے اس طرح بے چین ہوں جس طرح رمضان میں بعض اوقات شدت کے ساتھ پیاس محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میرا المیہ یہ ہے کہ میری پیاس کو لکھنے والا کوئی انتظار حسین یا منٹو نہیں ہے۔ شاید ہمیں انسان نہیں سمجھا جاتا۔ ان کی دلچسپی ہمارے وسائل سے ہے اور یہی ان کو پیارے ہیں۔ سردار عطاءاللہ مینگل اپنی بوڑھی آنکھوں کے ساتھ اپنے بیٹے اسد مینگل کی قبر کا پوچھتا ہے لیکن اسے کچھ نہیں بتایا جاتا۔

دوسری جانب ہمارے دانشور ہوں یا سیاست دان، ان سب کو اپنے سروں کی فکر ہے کہ اگر کوئی بات کریں گے تو ہمارے سر جائیں گے۔ جو کوئی بات کرتے بھی ہیں ان سے اکثر کہا جاتا ہے احتیاط سے بات کیا کرو نہیں تو مارے جاؤ گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مارے جانے کے لیے تو یہاں کسی 'جرم' کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بہت سارے ایسے لوگ دیکھے ہیں جنہوں نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ سیاست میں حصہ لینا تو دور کی بات وہ تو سیاست کی الف ب تک نہیں جانتے تھے وہ بھی مارے گئے۔ میرے ایک چچازاد بھائی کو کراچی سے اٹھایا گیا۔ اس کی اتنی بھی سیاسی معلومات نہ تھیں کہ سردار عطاء اللہ مینگل اور سردار اختر مینگل کی پوزیشن میں فرق کا بتا سکتا۔ بمشکل کوئی پچاس دن بعد واپس مل سکا۔

مجھے یاد ہے جب سردار اختر مینگل وزیر اعلیٰ تھے اور حیربیار مری ان کی حکومت میں وزیر تھے تو ان پر ایک پرنسپل کے اغوا کا الزام لگا۔ اس زمانہ میں جب اسمبلی میں رپورٹنگ کے لیے جاتے تو وہاں ہمارے صحافی ساتھی اس بات پر بہت ناراض تھے کہ یہ بہت بڑا ظلم ہوا ہے۔ حیربیار مری نے بڑا ظلم کیا ہے ایک پرنسپل کو اغوا کیا ہے۔ پھر چیف جسٹس امیر الملک مینگل نے اس کا نوٹس بھی لیا۔ یعنی ظلم کے حوالے

سے کوئی نہ کوئی آواز اٹھتی تھی لیکن آج جب بلوچوں کو عام غائب کیا جانے لگا تو کسی صحافی کو بھی گرجتے برستے نہیں دیکھا۔ نہ ہی کسی چیف جسٹس کو سو موٹو نوٹس لیتے دیکھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج خواہ بہت سی چیزیں بظاہر نظر نہیں آ رہی ہوں لیکن اندر اندر ایک طوفان موجود ہے۔

سی پیک کے حوالے سے یہاں بات کی جا رہی ہے لیکن اس کا اعتبار اور ضمانت کیا ہے کہ جو باتیں ہم یہاں رکھیں گے وہ کوئی سننے والا بھی ہے، تجاویز کا فائدہ کیا ہے؟ باتیں تو پہلے ہی ساری موجود ہیں۔ نواب اکبر بگٹی نے ڈوزیئر بھی لکھا تھا اسے آپ پڑھ لیں تمام چیزیں موجود ہیں۔ اس سے پہلے ہمارے تمام اکابرین نے جو باتیں رکھیں وہ تمام موجود ہیں لیکن جب نواب بگٹی جیسی شخصیت کو اس طرح شہید کیا جاتا ہے اور ان کی بات کو کوئی نہیں پوچھتا تو ہماری آپ کی کیا بات ہے۔

میں ہدایت الرحمٰن صاحب سے بالکل اتفاق کرتا ہوں کہ ہماری اپنی کمزوریاں بھی ہیں۔ میرا صحافی میرا نہیں ہے، میری سوسائٹی سے وہ تعلق نہیں رکھتا، میرا لکھاری میرا نہیں ہے، اس لئے کہ اس نے میرا دکھ نہیں لکھا۔ میرا سیاستدان میرا نہیں۔ میرا شاعر میرا نہیں ہے، وہ بھی جعلی ہے۔ وہ ان کے لئے لکھتا ہے، پہلے دربار تھا اب سرکار ہے۔ تو جہاں ادیب، صحافی اور دانشور بات کہنے کے لیے تیار نہ ہوں وہاں کس سے گلہ کریں۔ ہمارے بیوروکریٹ اس وقت تک بلوچ نہیں بنتے جب تک او ایس ڈی نہیں ہوتے یا ریٹائرمنٹ کو نہیں پہنچ جاتے۔ جب یہ سیٹ پر ہوتے ہیں تو ٹھیک طرح سے ہاتھ بھی نہیں ملاتے یہ بھی ہمیں اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے ہمیں باہر سے آنے والے دیکھتے ہیں۔ Paulo Coelho نے ٹھیک کہا ہے کہ جب کوئی قوم مغلوب و محکوم ہو جاتی ہے تو اس کے ایلیٹ اپنی قوم کی بجائے غالب قوم سے وفاداری نبھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں ان دربدر خاک نشینوں کے ووٹوں سے آگے نہیں آیا ہوں مجھے کہیں اور سے سلیکٹ کیا گیا ہے۔ اور جس نے سلیکٹ کیا ہے وہ اس سے وفاداری نبھاتے ہیں۔ اگر کوئی گورنر بنا ہے تو جانتا ہے کہ اسے گورنر کس نے بنایا ہے؟ وہ اس کی ہی خوشنودی کے لیے سرگرم رہتا ہے۔ چنانچہ اس پر حیرانی نہیں ہونی چاہیے کہ نواب اسلم رئیسانی خود کہتے تھے کہ بلوچستان اسمبلی کی قرارداد یں اسلام آباد میں ایک سیکشن آفیسر چیک کرتا ہے۔

درحقیقت ہمارے جو نمائندے چنے جاتے ہیں وہ ہمارے نہیں ہوتے بلکہ ہم پر مسلط کیے جاتے ہیں۔ یہاں کبھی حقیقی سیاسی پراسس کو زندہ نہیں رکھا گیا۔ اسے ہمیشہ اوپر سے تھونپا گیا ہے اسی کے نتیجے میں حالات یہ ہیں کہ جس کے پاس پیسے ہیں وہ اس کے بل پر ایم پی اے بن جاتا ہے۔ اس کے بعد یہی لوگ کہتے ہیں اسمبلی پیسے کمانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

تعلیم کی حالت یہ ہے کہ بلوچستان یونیورسٹی نیم فوجی چھاؤنی ہے۔ میں پروفیسر ہوں لیکن مجھے گھر جانے کے لئے کارڈ دکھانا پڑتا ہے۔ سپاہی اٹھتا ہے مجھے روکتا ہے کہ کہاں جا رہے ہو، میں کہتا ہوں گھر جا رہا ہوں پوچھتا ہے کارڈ ہے، جی کارڈ ہے پھر وہ مجھ سے میرا مکان نمبر بھی پوچھتا ہے۔ یہ ہماری عزت ہے۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ یہاں تعلیم نہیں ہے، لوگ پڑھتے نہیں ہیں۔ آج بھی ہمارے طلبہ تین میڈیکل کالجز جنہیں منظور کیا گیا ہے کو فعال بنانے کے لئے بھوک ہڑتال پر ہیں۔ آئی ٹی یونیورسٹی میں بلوچوں کو داخلہ نہیں ملتا اس کے لئے بھی بھوک ہڑتال کی لیکن کس نے سنا۔ آج بھی ڈگری کالج کوئٹہ مردم شماری کی وجہ سے بند ہے۔ لیکن کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ ہم سب لوگ یہاں سطحی باتیں کرتے

ہیں۔ ہمیں لوگوں کے دکھ اور کرب کا اندازہ نہیں ہے۔ یونیورسٹیوں میں بلوچ آپ کو خاکروب کا کام کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ المیہ نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ آپ نے اس قوم کو جو اس خطے کے مالک ہے خاکروب بنا دیا ہے اور اگر اس پر کوئی بات کرے تو اس کا سر اڑا دیا جاتا ہے۔ یہ المیہ ہے کہ بولتا کوئی نہیں۔ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خاموش رہ کر بچ جائیں گے تو جان لینا چاہیے کہ بچے گا کوئی نہیں۔ میرے خیال سے آنے والے دن بہت زیادہ سخت ہوں گے اور اس کی وجہ یہ سی پیک ہے۔

سی پیک سیدھا سادہ مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی انٹرنیشنل dynamics ہیں جس پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے۔ ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب تہذیبوں کا تصادم کے آخری باب میں وضاحت سے لکھا ہے کہ ویسٹ کا غلبہ اور اقتدار ختم ہو کر اب ایشیا کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ اور ایشیا میں جو بڑی قوت بن سکتی ہیں ان میں چین، روس، انڈیا، انڈونیشیا اور جاپان شامل ہیں۔ اس طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ چین ایک سپر پاور کے طور پر ابھر رہا ہے۔ یہ ہماری طرف آ رہا ہے۔ طاقت ایک سامراج کے ہاتھ سے دوسرے سامراج کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ ظاہر ہے مغرب یا امریکہ اس پر خوش نہیں ہے۔ علاقہ میں چین کا جو مدمقابل ہے وہ ہندوستان ہے۔ اگر ہندوستان سیکیورٹی مسائل میں نہ الجھا ہو اور اکانومی میں آگے بڑھ رہا ہو تو ویسٹ اور امریکہ اسے ہی سپورٹ کریں گے۔ گوادر سے جڑا بحری راستہ ۷۰ فیصد توانائی کا ذریعہ ہے۔ جس کے پاس یہ راستہ ہو گا وہ اگلے دور کا سپر پاور ہو گا۔ اس طرح یہ بہت بڑوں کی جنگ ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ چین کے بارے میں پنجاب کے دانشوروں کی کیا رائے ہے۔ تاہم خدشہ ہے کہ کل وہ بھی رو رہے ہوں گے۔ کیونکہ چین صرف خود نہیں آتا وہ اپنا لیبر بھی ساتھ لے کر آتا ہے اور اس میں یقیناً جنگ ہو گی۔

بلوچستان بہر حال وار تھیٹر ہے اور یہاں پر آگ لگی ہوئی ہے۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ ہم یہاں ترقی چاہتے ہیں۔ دنیا میں ایسی کوئی مثال ہم نے تو نہیں دیکھی کہ کسی اور قوم نے آ کر دوسری قوم کو ترقی دی ہو۔ یہی دعویٰ لے کر برطانیہ نے نوآبادیات قائم کیں۔ اس کا کہنا تھا کہ سفید آدمی کا فرض ہے کہ وہ جاہلوں اور گنواروں کو تہذیب سکھائے۔ اصل میں وہ وسائل پر قبضہ کے لیے آئے ہیں۔ بلوچ زندہ رہتا ہے یا مر جائے ان کے لیے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہاں پر کہا جاتا ہے کہ کتا مارا جائے اس کا وارث ہے لیکن بلوچ کا وارث نہیں ہے۔ در حقیقت مختلف اقدامات کے ذریعہ ہمیں یہی باور کرایا گیا ہے۔ ہمارے سیاستدان کبھی پارلیمنٹ اور کبھی تحفظات کی بات کرتے ہیں لیکن وہ ان تمام چیزوں میں خود بھی شامل ہیں۔ ان کی بزدلی، ڈرامہ بازیوں اور دھوکے بازیوں نے بلوچ قوم کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آج ان کی دھوکے بازیوں کی وجہ سے نوجوان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں لیکن ان نوجوانوں کی بات کوئی بھی نہیں کر رہا۔

کوئٹہ میں آپ کسی طرف بھی جائیں تو راستے کی چیک پوسٹوں پر اپنی عزت کا پتا چل جائے گا۔ ان چیک پوسٹوں پر عام آدمی ہی نہیں ہمارے بڑے بڑے بھی بے عزت ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بتاتے نہیں ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے سردار اور نواب جب پنجاب جاتے ہیں تو ہمیں پتا ہے کہ وہاں وزیر اعلیٰ کے سیکیورٹی گارڈز بھی ان سے ملنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہی لوگ یہاں آ کر ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ در حقیقت جب کوئی بھی قوم سیاسی طور پر مغلوب ہوتی ہے تو اپنا غصہ اپنے آپ پر اتارتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں

جب ہندو اور مسلمان انگریز سے لڑ نہیں سکتے تھے تو آپس میں لڑتے تھے۔ جبکہ ہندوستان میں تو اس وقت بیوروکریسی اور ساری ملازمتیں خود ہندوستانیوں کے پاس تھیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیا میں اپنے گھر میں اپنی مرضی کے ساتھ رہنے کا مالک ہوں یا نہیں۔ یہ میرا گھر ہے یا نہیں ہے۔ یہاں پر باہر سے آنے والا سپاہی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں مجھ سے زیادہ اس شناختی کارڈ کی اہمیت ہے جس کے پاس یہ نہیں ہوتا اسے عقوبت خانوں میں پھینک دیا جاتا ہے اور کوئی عدالت نہیں پوچھتی۔

مردم شماری پر تو عدالت بہت تیز ہے کہ یہ ہونی چاہیے لیکن ڈیرہ بگٹی، کوہلو، خضدار اور قلات اور دوسرے علاقوں سے بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کر چکے ہیں۔ اس طرح بہت سارے علاقے قحط کی وجہ سے خالی ہو گئے ہیں، یا اسی طرح نصیر آباد سے لوگ سیلاب کی وجہ سے منتقل ہو گئے ہیں۔ ان علاقوں میں آپ کیا مردم شماری کریں گے۔ یہ بھی ایک طرح کا ڈنڈا ہے جو بلوچ قوم کو دکھایا جا رہا ہے۔ ایک طرح سے میں خوش ہوں کہ بلوچوں کو اقلیت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ شاید ہمارے اشرافیہ کو پتا چلے ان کی اوقات کیا ہے کیونکہ وزارت اعلیٰ پر بھی ان کو آنا ہوتا ہے۔

> دنیا میں طاقت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے۔ چین کا اس میں ایک اہم کردار ہے۔ وہ یہاں آ رہا ہے تو اس کے مدمقابل قوتیں اس کا راستہ روکنے کے لیے یہاں عدم استحکام پیدا کریں گی۔ یہ ایک سامراج کی دوسرے سامراج کے خلاف جنگ ہے اور ہم اس کا ایندھن بن رہے ہیں۔

سی پیک سے ہمیں کیا ملے گا؟ ہم تو بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ کی حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ صورت خان مری لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۰ کی دہائی میں بگٹی قبیلے کے کچھ لوگ اسلام آباد گئے اور وہاں بیوروکریسی سے بات کی کہ ہمیں سوئی گیس چاہیے تو انہوں نے ایک میٹنگ کی اور کہا کہ بگٹی جاہل ہیں انہیں گیس دے دی تو وہ تو اپنے گھر جلا بیٹھیں گے۔ اب وہ واقعی اپنے گھر جلا رہے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا تھا کہ اس بار کی جنگ میں پرچھائیاں بھی جل جائیں گی اور خطرہ ہے کہ واقعی پرچھائیاں جل جائیں گی، بچے گا کچھ بھی نہیں۔

اس بحران کی بہت سی شکلیں ہیں۔ ۲۰۰۳ میں غالباً میں نے اے آر صدیقی کا ایک انٹرویو پڑھا تھا۔ صدیقی صاحب ۱۹۷۰ کے عشرے میں یہاں آئی ایس پی آر کے ڈی جی تھے۔ انہوں نے کہا کہ اب کی بار اگر بلوچستان میں آپریشن کیا گیا تو ۱۰۰ سال تک پاکستان اس کے بحرانوں سے نہیں نکل سکے گا۔ لیکن ان کی بات کسی نے نہیں سنی۔ بحرانوں کی ہی شکل یہ بھی ہے کہ اس ملک میں تو منٹو، فیض اور اقبال احمد جیسے لوگوں کو بے عزت کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سارے پنجابی ہیں بلوچ نہیں ہیں۔ فیض صاحب کو ہتھکڑیاں پہنا کر بازاروں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ کیا جالب کو بھول گئے، جالب کے ساتھ کیا کیا نہ کیا گیا۔ درحقیقت اگر بات نوآبادیات کی ہے تو نوآبادیات میں جب انگریز تھا تو یہاں اقبال اور منٹو بھی تھے۔ لیکن اس طرح نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تو آپ ایک روز کسی فنکار یا شاعر کو اٹھاتے ہیں اور اگلے روز اس کی مسخ شدہ لاش ملتی ہے۔

بحران کی ایک شکل تعلیم کے میدان میں ہے جو صحیح غلط کی پہچان نہیں صرف تابعداری کا سبق دیتی ہے۔ بحران کا تعلق لکھنے والوں سے بھی ہے۔ یہ کون ہیں یہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ جو صحیح لکھنے والے ہیں انہیں موقع ہی نہیں ملتا۔ درحقیقت بلوچستان کی نمائندگی وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں سرکار نے گڈ بکس میں رکھا ہوا ہے جن سے سرکار کو کوئی خطرہ نہیں ہے، یہ لوگ ڈرتے ہیں کہ حقائق کے بارے میں بولے تو جان چلی جائے گی۔ یہاں ہمیں بولنے، لکھنے اور تقریر کا موقع ہی نہیں ملا۔

آج بھی یہاں وہی مائنڈ سیٹ ہے جو قیام پاکستان کے وقت تھا۔ اس وقت کے کچھ دانشور سندھی حضرات پاکستانی حکومت کے ایک بڑے عہدیدار سے ملنے گئے کہ ہمارے کلچر کا کیا بنے گا؟ تو اس نے ہنس کر کہا کہ کون سا کلچر! گدھوں اور خچروں کا کلچر، تم ان کے لیے پریشان ہوتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں وہی مائنڈ سیٹ آج بھی موجود ہے۔ بلوچ کا کلچر ان کے لئے گدھے اور خچر کا کلچر ہے۔ اس کو بچانے کی انہیں فکر نہیں ہے، انہیں بلوچوں کی حالت سے کوئی فرق نہیں پڑتا، انہیں صرف یہاں کے وسائل سے مطلب ہے۔ لیکن جس طرح سے وہ سوچ رہے ہیں یہ وسائل اس طرح انہیں نہیں ملیں گے۔ کیونکہ جب ایک مرتبہ جنگ شروع ہوتی ہے یا گھر جلنا شروع ہوتے ہیں تو اس کی آگ بہت پھیلتی ہے۔ مشرقی پاکستان سے آپ نے سبق حاصل نہیں کیا۔ ہندوستان کی تقسیم سے آپ نے سبق حاصل نہیں کیا اب بھی آپ سبق حاصل نہیں کریں گے؟ اگر بلوچ مرتے رہیں گے تو پاکستان بھی سیاسی استحکام کو ترستا رہے گا۔ شکریہ

> جگہ جگہ چیک پوسٹیں ہیں۔ ہم اپنے ہی علاقہ میں آزادی سے نہیں جا سکتے۔ توہین آمیز سلوک ہم سے کیا جاتا ہے۔ یہاں باہر سے آنے والا سپاہی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ کہاں جا رہے ہو؟ مجھ سے زیادہ میرے شناختی کارڈ کی اہمیت ہے جس کے پاس وہ نہیں اسے پھینک دیا جاتا ہے۔

فاروق سرور

ایڈووکیٹ، کالم نگار

میں چونکہ لٹریچر سے تعلق رکھتا ہوں اس لیے اگر میں اپنی علامتوں کی زبان میں بات کروں تو امید ہے آپ لوگ برا نہیں منائیں گے۔ اور ہمارے جتنے بھی ساتھی ادھر آئیں گے ان کے دانشورانہ معیار میں بہتری آئے گی، کمی نہیں ہو گی۔

میں جب میٹرک کے بعد کالج میں آیا تو مجھے رنگوں کا علم ہوا۔ ایک رنگ تھا جس کا سب ذکر کرتے تھے میں جب پڑھتا تو مجھے وہ رنگ دکھتا، جب سوتا تو وہی رنگ سامنے ہوتا جب جاگتا تھا تو بھی وہی رنگ نگاہوں میں ہوتا۔ ہمارے جلسے ہوتے تھے تو اس میں بھی اسی رنگ کی بات ہوتی تھی۔ اسی رنگ کی وجہ سے ہم نے نور محمد ترہ کئی کو پڑھا۔ اسی رنگ کی وجہ سے ہم نے گورکی اور سارتر کو پڑھا۔ اسی رنگ نے ہم سے رشین لٹریچر کو متعارف کروایا۔ وہ رنگ سرخ رنگ تھا میرے خوابوں کا رنگ۔

اب اگر کہیں میں خواب دیکھتا ہوں تو مجھے وہ رنگ تو نظر نہیں آتا، مجھے سفید دھبے نظر آتے ہیں۔ میں جب ان دھبوں کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو کبھی وہ بادلوں کی صورت میں اڑ رہے ہوتے ہیں سفید دھبے۔ لیکن جب میں آنکھیں کھولتا ہوں تو وہ سرخ رنگ جس کے میں خواب دیکھا کرتا تھا اس کی بجائے بلوچی اور براہوی لٹریچر میں، سندھی، پشتو لٹریچر میں، فارسی اور سرائیکی میں سیاہ رنگ نظر آتا ہے۔ اس سیاہ رنگ کو دیکھ کر میں چیخنے لگتا ہوں کیونکہ اس رنگ میں اندھیرا ہوتا ہے۔ اس اندھیرے میں بلائیں ہوتی ہیں وہ مجھے ڈراتی ہیں میرے خوابوں کو nightmares میں بدل دیتی ہیں۔

سو اب اس وقت میں سیاہ رنگ کی دنیا میں رہ رہا ہوں۔ لیکن اکثر اوقات مجھے سفید رنگ بھی اپنے دھبوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے کبھی کبھار میں اپنے خواب میں ایک عجیب سی کوشش کرتا ہوں خواب میں شعوری کوشش کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ اب وہ سفید بادل سفید فاختوں کی شکل میں اڑ رہے ہیں اور جب میں جاگتا ہوں تو میری زبان پہ یہ دعا ہوتی ہے کہ خدایا ان دور اڑتی فاختاوں کو ہمارے گھر کی منڈیر پر اتار دے۔ بہت شکریہ

امان اللہ شادیزئی
دانشور، صحافی
سابق صدر
کوئٹہ یونین آف جرنلسٹ

میں مختصر بات کروں گا کہ بلوچستان کو پنجاب سے کیا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو حقوق پنجاب کے لوگوں کے ہیں وہی بلوچستان کے لوگوں کو دیے جائیں تو بلوچستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ چھوٹے صوبوں کو سوال اٹھانا چاہیے کہ اگر مشرقی پاکستان کی اکثریت کو پنجاب نے تسلیم نہیں کیا تھا تو آج وہ اپنی اکثریت کیسے منوا سکتا ہے۔ ورنہ پنجاب کی ۱۲ کروڑ کی آبادی کے سامنے ان سے کہیں کم بلوچ یا پشتون کی بات کی پارلیمانی نظام میں کیا اہمیت ہے۔ پنجاب نے بنگال کی آبادی کو نہیں مانا تو آج وہ اپنی آبادی کو ہم پر کیوں مسلط کرتا ہے۔ یوں جب تک آپ حقیقی مسئلے کی طرف نہیں جائیں گے تو مسائل حل نہیں ہوں گے۔

> پنجاب کو تقسیم کر کے مزید صوبے بنانے چاہییں تاکہ صوبوں کے درمیان توازن قائم ہو سکے اور سینیٹ بھی زیادہ مؤثر اور متوازن ہو۔

واضح رہنا چاہیے کہ موجودہ پارلیمانی نظام میں بلوچستان قیامت تک اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر پارلیمانی نظام ہی رہنا ہے تو پنجاب کو تقسیم ہونا چاہیے کم از کم دو صوبے بننے چاہییں۔ دوسری جانب فاٹا کو صوبہ بننا چاہیے تاکہ سینیٹ کے اندر پاور ہو اور توازن برقرار ہو سکے۔ ورنہ سی پیک نہیں پچاس دوسرے منصوبے بھی آجائیں توازن پیدا نہ ہوگا۔ دوسری جانب سینیٹ کو طاقتور کریں۔ سینیٹ کے ارکان کو مکمل اختیارات ہوں۔ اس سے ہماری آنے والی نسلیں احسان مند ہوں گی اور آنے والے دنوں میں مشکلات کا شکار نہیں ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں قوم پرست سیاست اس بنیاد پر کرنی چاہیے کہ بلوچستان کے اصل حقوق کی بات ہو سکے۔ ورنہ ہم اپنے حقوق کبھی بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔

۲۰۱۱ میں، میں بلوچستان اسمبلی کے بجٹ سیشن میں موجود تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کی اور دیگر اسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں۔ کل ملا کر صوبے اور مرکز میں کم از کم چالیس ہزار ملازمتیں ۲۰۱۱-۱۲ میں بلوچستان کی خالی تھیں۔ وزیر اعلیٰ عبدالمالک میرا دوست بھی تھا اور شاگرد بھی، لیکن اس کے دور میں بھی پچیس ہزار ملازمتیں بلوچستان میں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ ایسے میں بلوچ نوجوان ہوں یا پشتون، پہاڑوں پر نہیں جائیں گے تو کہاں جائیں گے۔ ڈاکے نہیں ماریں گے تو کیا کریں گے۔ ایک ایم اے پاس نوجوان جب ڈگری لے کر پھرے گا اور اس کو نوکری نہیں ملے گی تو اس کے پاس کیا امکانات رہ جائیں گے۔ دوسری جانب وہ نوجوان اپنے گھر کو دیکھتا ہے جہاں اس کی جوان بہن

موجود ہے لیکن اس کی شادی نہیں ہو سکتی، اس کی ماں موجود ہے لیکن وہ گھر کی کفالت نہیں کر سکتا۔ تقریباً ۱۱ لاکھ کے قریب نوجوان بلوچستان میں بے روزگار ہیں۔ پنجاب میں بھی بے روزگاری ہے لیکن وہاں ۱۲ کروڑ کی آبادی میں ساڑھے آٹھ لاکھ بے روزگار ہیں۔ یہ فرق کیوں؟ اس لیے کہ بلوچستان کے جو حقوق مرکز کے پاس تھے ان کو لینے والا کوئی نہیں تھا۔ حیرت ہے کہ صوبہ سرحد کے صرف ۵۰ ہزار نوجوان بے روزگار ہیں اور ہمارے ایک کروڑ کے اندر گیارہ لاکھ بے روزگار۔ وزارت خارجہ میں ۴۵۰۰ ملازمتیں ہیں۔ بلوچستان کوٹے سے ۱۳۵۰ بھی تک خالی پڑی ہیں۔ میں نے صدر پاکستان سے ایک سوال کیا کہ ۴۵۰۰ ملازمتیں ہیں وزارت خارجہ میں اور آپ ایک بلوچ چپڑاسی بتائیں۔ جواباً انہوں نے کہا یہ کیا سوال ہے، تو میں نے کہا یہی تو سوال ہے۔ ایک بلوچ چپڑاسی اگر فرانس میں لگے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا خاندان خوشحال ہو جائے گا۔ ۶۵ سفارت خانوں میں ایک چپڑاسی بھی بلوچ نہیں ہے۔ نیشنل آرمی کی بات کریں، میں نے ایک بار بات کی کہ چھ لاکھ کی فوج کے اندر صرف ایک قادر بلوچ جرنیل بنا ہے۔ اگر آپ ۷ فیصد بھی لے لیں تو کم از کم پچاس ہزار کے قریب ہمارے بلوچ ہوں گے۔ اس میں افسروں میں بھی ہمارے لوگ آئیں گے اور جرنیلوں میں کم از کم ۸/۱۰ تو ہمارے ہوں گے۔

> موجودہ پارلیمانی نظام میں قومی اسمبلی میں نشستوں کی اکثریت کی بناء پر پنجاب کی بالادستی قائم رہے گی۔ اس میں بلوچستان کو اس کے حقوق نہیں مل سکتے۔

نواب رئیسانی کے دور میں ہر ایم پی اے کو ایک ارب ۳۵ کروڑ روپیہ ملا ہے۔ اگر حقیقت میں یہ رقم اپنے اپنے علاقوں میں خرچ ہوتی تو بہت سی چیزیں بہتر ہو جاتیں۔ بالخصوص جبکہ ہماری آبادی کم تھی اور یہ وسائل بہت ہیں۔ درحقیقت ہمیں سب نے ہی لوٹا ہے، جس کو موقع ملا اس نے اپنے ہی مفادات کو ترجیح دی۔ اس میں بلوچ اور پشتون ایم پی ایز دونوں ہی شامل ہیں۔

کرپشن کی بات کی جائے تو ذاتی مشاہدہ ہے کہ جو بھی اسمبلی سے نکلا خوشحال نکلا۔ میرے سامنے ایک صاحب، نام نہیں لینا چاہتا، ۲۰۰۸ میں رکشے سے اترتا تھا۔ اب اسلام آباد میں کروڑپتی ہے۔ کوئی احتساب نہیں نہ کوئی پوچھنے والا ہے۔ کچھ لوگ قوم پرستی کے نام پہ لوٹ رہے ہیں، کچھ اسلام کے نام پر اور کچھ بائیں بازو اور سیکولرازم کے نام پر لوٹ رہے ہیں۔ ہر وہ فلسفہ جو کام کا تھا اس کے نام پر بلوچستان کو لوٹا جا رہا ہے۔

دوسری جانب افغانستان اور ایران ہمارے ہمسائے ہیں۔ ان کے ساتھ بہتر تعلقات کا بلوچستان کو براہ راست فائدہ ہے۔ لیکن ہم تعلقات آگے بڑھانے کے مواقع ضائع کرتے ہیں۔ آپ نے ایران کے ساتھ کیا کیا؟ ایران سے گیس کا معاہدہ ہے، اس کے باوجود نواز شریف نے کہیں زیادہ مہنگا ایل این جی کا معاہدہ کر لیا۔ پتہ نہیں ہم کس کس کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور اپنا خانہ خراب کرتے ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ موجودہ پارلیمانی نظام میں آپ آخر تک حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ اس نظام کے تحت قومی اسمبلی میں بلوچستان کے چند MNAs ہیں جس میں اکبر بگٹی جیسے لوگ بھی شامل رہے ہیں کوئی بڑا فیصلہ نہیں کرا سکتے۔ اس نظام کو ختم کریں سینیٹ کو پاور فل بنائیں اور پنجاب کو کم از کم دو صوبوں میں تقسیم کریں۔ باقی بھی جو صوبے تقسیم ہو سکتے ہیں ان کو تقسیم کریں۔ میرے خیال میں اس کے نتیجہ میں مسائل کا حل ممکن ہو سکے گا۔

سلیم شاہد

بیورو چیف، ڈیلی ڈان

بلوچستان کے حوالے سے سول سوسائٹی، میڈیا اور دانشور جب اظہار خیال کرتے ہیں تو پہاڑوں پر جانے والوں کے بارے میں ایک ہی بات کہی جاتی ہے کہ یہ حکومت پاکستان اور پاکستان کے خلاف لڑنے کی بات کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ اپنے گھر بار، محلے گلیاں سب چھوڑ کر وہ ان پہاڑوں اور غاروں میں جہاں پانی بھی نہیں ہے کیوں چلے گئے۔ پہاڑوں پر جانے والے یہ سارے لوگ، چاہے نواب اکبر بگٹی ہوں یا خیر بخش مری ہوں، حیر بیار مری اور بالاچ مری ہوں، اسی پاکستان میں، اسی بلوچستان میں، اور اسی سسٹم میں رہتے تھے۔ ان میں سے کئی قومی و صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی رہے اور وزیر بھی۔ یہ سب درحقیقت حکومتوں میں رہے ہیں۔ تو کیا وجہ ہوئی کہ وہ اس نظام کا حصہ رہنے کے بجائے غاروں میں چلے گئے؟

ماضی میں بھی کہتے ہیں کہ لوگوں کو پہاڑوں سے واپس لانے اور حیدر آباد سازش کیس ختم کرنے کے بعد بلوچستان میں بڑا سکون تھا لیکن اس دوران حکومت نے بلوچستان میں جس طرح کرپشن کو فروغ دیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہر رکن صوبائی اسمبلی (MPAs) کو ترقیاتی پروگرام کے نام پر اسّی اسّی لاکھ روپے دیے گئے۔ فطری طور پر ان MPAs نے خیال کیا کہ یہ تو بہت اچھا سودا ہے ہم الیکشن لڑیں گے، ترقیاتی پروگرام کے نام پر اسی پچاسی لاکھ لیں گے اور پھر حکومت بھی کریں گے۔ اس طرح ایک طبقے کو تو بہت کچھ دے دیا گیا لیکن باقی بلوچستان اور یہاں کے لوگوں کے لیے کیا کیا گیا؟ اب اگر یہ باقی لوگ اپنے لیے پانی یا کوئی اور سہولت مانگتے ہیں تو سوال کیا جاتا ہے کہ آپ نے آواز کیوں اٹھائی۔ ایوب خان سے لے کر جنرل مشرف تک جو بھی ڈکٹیٹر آیا اس نے اپنے آپ کو دوام دینے کے لیے انتخابات کروائے۔ کیونکہ ان کے پاس اپنی کوئی پولیٹیکل بنیاد نہیں تھی۔ ایسا کوئی سیاسی پلیٹ فارم نہیں تھا جہاں سے وہ اپنے آپ کو recognize کرواتے۔ غیر جماعتی الیکشن کروانے کے بعد انہوں نے ایک پارٹی کو جسے ہم سمجھتے ہیں کہ غیر قانونی پارٹی ہے اسے لا کر ہم پر مسلط کر دیا۔ راتوں رات لا کر کہا کہ یہ ہے اکثریتی پارٹی مسلم لیگ۔ اس نظام میں اپنی تائید کو برقرار رکھنے کے لیے ارکان اسمبلی کو نوازا گیا۔ درحقیقت ایوب خان کے زمانے سے لے کر مشرف تک بلکہ آج بھی جو کچھ ہو رہا ہے وہ ناانصافیوں پر مبنی ہے۔ مگر اس کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو کوئی سننے والا نہیں تھا۔

جب لوگوں کا بس نہیں چلا تو کوئی راستہ تو انہوں نے چننا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ہمیں پارلیمنٹ کے ذریعے اپنا حق لینا چاہئے، کچھ دوسرے لوگ دوسرے ذرائع سے آواز اٹھانے پر زور دیتے ہیں۔ اسی تسلسل میں کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمیں بندوق کے ذریعے اپنا حق لینا چاہئے۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ایسا

کیوں ہوا ہے۔ مجھے سخت شکایت ہے اس ملک کے دانشوروں سے کہ انہوں نے آواز کیوں نہیں اٹھائی۔ بعض احباب یہاں بھی موجود ہیں جب وہ اعلیٰ عہدوں پر براجمان تھے تب انہیں کوئی خیال نہیں آیا۔ آج ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ہر جگہ بولتے ہیں اور انہیں سنا جاتا ہے۔ درحقیقت سیاسی لوگوں کو سنا جاتا تو آج یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ رائے عامہ کے آج جو سروے آتے ہیں ان کے مطابق سب سے زیادہ جس پاپولر جماعت کا نام لیا جاتا ہے وہ میرے خیال کے مطابق تو سب سے کم پاپولر جماعت ہے۔ معلوم نہیں وہ کیسے سروے ہوتے ہیں لیکن بہت سے فیصلے پھر ان سرویز کے مطابق کیے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے سرویز میں سول سوسائٹی کا بھی ایک کردار ہوتا ہے جس کے اپنے اہداف اور ایجنڈے ہیں۔ سول سوسائٹی سے وابستہ این جی اوز مخصوص ایشوز اٹھاتی ہیں لیکن ہمارے معاملہ میں سول سوسائٹی بھی غائب ہے۔ اگر سول سوسائٹی اپنا حقیقی کردار ادا کرتی تو یہ حالات نہ ہوتے۔ اگر اس ملک کا دانشور میرے اور آپ کے دکھ پر اٹھتا اور لکھتا تو آج بلوچستان شکوہ نہ کر رہا ہوتا۔

پنجاب اور اسلام آباد کی زیادتی کی بات کی جاتی ہے۔ میں اسلام آباد کی بات کرتا ہوں پنجاب کی نہیں، پنجاب تو ایک صوبہ ہے اور جس طرح بلوچ یا پٹھان ایک قوم ہیں پنجابی بھی ایک قومیت ہے۔ اسلام آباد کا مائنڈ سیٹ اصل مسئلہ ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ سوچتا ہے اسی پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ وہ دانشور بلاتے ہیں جو یہاں مخصوص مقامات پر ٹھہرتے اور مخصوص لوگوں سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہی کچھ دیکھتے سنتے ہیں جو مخصوص لوگ دکھانا اور سنانا چاہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں فیصلہ سازی کے ذمہ دار اگر کبھی خود بھی آجایا کریں اور یہاں کے لوگوں سے ملیں تو انہیں صورت حال کا درست طور پر اندازہ ہوگا۔

آپ نے سی پیک کی بات کی مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں سی پیک کی کیا بات کروں۔ کیا سی پیک میرا ہے؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ اس کا مغربی روٹ کب شروع ہوگا۔ ملک کا وزیراعظم چند بڑے بڑے لیڈروں کو ساتھ لے کر جاتا ہے اور اعلان کر دیتا ہے کہ ہم مغربی روٹ کا افتتاح کر رہے ہیں جبکہ وہ ایشین ڈویلپمنٹ بینک کا پہلے کا ایک پروجیکٹ تھا۔ لیکن ہمیں تو ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ اس سے بلوچستان کو کیا فائدے ہوں گے یہ ہمیں کسی نے نہیں بتایا۔ حکومتی ذمہ دار آتے ہیں اور ہر جگہ ایک سٹیریوٹائپ بیان دیتے ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا جائے کہ بلوچستان کے کون سے منصوبے ہیں تو جواب میں گڈانی پاور پارک منصوبے کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اور اب تو اسے بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ سو میرا تو سی پیک میں یہی حصہ ہے کہ میں چائے کی کوئی دکان کھول لوں یا سڑک کے کنارے پنکچر کی دکان بنالوں یا کوئی ہوٹل شروع کر لوں یا شاید ایک دو پیٹرول پمپ شروع ہو جائیں گے۔ کیا یہ کوئی قابل ذکر فائدہ ہے؟ مجھے اس بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ میرے حصے میں کیا ہے اور میرے لوگوں کو کیا ملے گا۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو میں تو اپنے مستقبل کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کر سکتا۔ میں تو تب ہی رائے دوں گا جب اس منصوبے کے بارے میں کچھ جانتا ہوں گا۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ اس میں سب کچھ طے ہے، کس کے حصے میں کیا ہے اور جیسے بچوں کو گود لیا جاتا ہے اسی طرح ہماری مختلف چیزوں کو گود لیا جا رہا ہے۔

صورت حال عملاً ایسی ہے جیسے انگریز برصغیر میں اپنے مفادات اور ترجیحات کے مطابق کچھ علاقوں میں دنیا کا جدید ترین سسٹم لے آیا تھا۔ پنجاب میں اس کا مفاد آبپاشی کے نظام میں تھا وہ وہاں لے آیا، سندھ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بلوچستان میں اس کی ترجیح وہ نہیں تھی۔ اگر فارورڈ پالیسی نہ ہوتی تو یہ ریلوے لائن بھی نہ آتی۔ اور یہ جو راستے ہیں ہم ان سے بھی محروم ہوتے۔ یہی پالیسی اب بھی اپنائی گئی ہے۔

آپ دیکھیں یہ غور کرنے کی باتیں ہیں کہ میرانی ڈیم ۱۹۵۰ کے عشرے میں پروپوز ہوا اور کب بنا؟ گوادر پورٹ پر کام کا تصور اور خاکہ کئی دہائیوں قبل سے موجود تھا۔ اس کے لیے فیزیبلٹی رپورٹ بھی بنی تھی۔ تاہم اس پر کام کا آغاز اب جا کر اس طرح ہوا ہے کہ مجھ سے کوئی نہیں پوچھتا کہ میری ضرورت کیا ہے۔ یہ منگی ڈیم پر کام کا افتتاح ہوا ہے اس کی فزیبلٹی رپورٹ ۱۹۶۲-۱۹۶۳ کی ہے اور اب جا کر گراونڈ بریکنگ کی تقریب ہوئی ہے۔ گھر میرا ہے لیکن میرے گھر میں کہاں کس کمرے کی ضرورت ہے، اس پر میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آخر ایسے میں سی پیک کی اونرشپ میں کیسے لوں؟ گوادر بنا لیکن نہ مجھے پانی ملا اور نہ ہی دوسرے بنیادی مسائل حل ہوئے۔ گوادر ایک پورٹ ہے جو سمندر کا حصہ ہے اسے ایک سڑک سے لنک کر دیا گیا ہے اور اب اسے سی پیک سے جوڑ دیں گے۔ اب جب یہ سب کچھ چین کے لئے ہے تو وہاں گوادر میں پائپ لائن ڈالنے کے لئے بھی چین سے لوگ لائیں گے؟، جو وہاں بیٹھا ہوا ہے اسے آپ شامل ہی نہ کریں۔ کام چین کی کمپنی کو ہی دیں لیکن یہاں کسی مقامی مزدور اور ٹھیکیدار کو کام بھی نہ ملے۔

[اسلم بھوتانی: صورت حال یہ ہے کہ چینی کمپنی کے ایک سو پیر کے لئے بھی ہمارے چار جوان پہرا دیتے ہیں۔ یعنی جوان کھڑا ہے اور چینی مزدور کام کر رہا ہے۔]

یہ سب ہمارے احساسات ہیں اگر آپ انہیں رپورٹ کر سکتے ہیں تو بہت دل سے ہم نے یہ باتیں کی ہیں۔ آخر میں اس شعر کے ساتھ کہ

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

میں اپنے سینئر دانشوروں کو سننے آئی تھی آخر میں موقع ملا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

اوڑھے ہوئے ہیں کب سے ردائے سراب ہم
ذروں میں دیکھتے ہیں ستاروں کے خواب ہم

بلوچستان کے عوام کو بھی کچھ اسی طرح سراب کے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ بطور وکیل لوگوں کے دکھ درد قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ دوسری جانب یوں بھی زمینی حالات سے بخوبی واقف ہوں کہ میں خود ایک سیاسی کارکن بھی ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے ہم نے سبی، مچھ، ڈھاڈر، کچی، جعفر آباد، نصیر آباد اور صحبت پور جیسے علاقوں کا سفر کیا اور کئی روز لوگوں کے ساتھ رہے۔ کوئٹہ سے چلتے ہوئے میرے ذہن میں تھا کہ میں ان علاقوں میں جا کر عورتوں کے حقوق پر بات کروں گی۔ تاہم وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ وہاں تو ابھی تک بنیادی انسانی ضروریات بھی نہیں پہنچیں، پینے کا صاف پانی نہیں، چنانچہ وہ لوگ گدلا پانی پیتے ہیں جس کے باعث بہت سی بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہماری ایک ساتھی ان بیماریوں کا شکار ہو کر فوت ہو گئی۔

صابرہ اسلام
ایڈووکیٹ
نیشنل پارٹی

جب خواتین سے ملی تو میرے ذہن میں یہ تھا کہ میں ڈومیسٹک وائلنس پر بات کروں گی۔ میں نے سوال پوچھا کہ کیا شوہر مارتے پیٹتے ہیں؟ جواب ملا: ''ہمیں کوئی نہیں مارتا ہمیں تو غربت نے مارا ہوا ہے''۔ جب آپ کے پاس پینے کا صاف پانی نہیں، بچیوں کے سکول، ہسپتالوں میں بنیادی آلات تک میسر نہیں۔ زچگی کا کوئی پیچیدہ کیس آجائے تو مریض کو کوئٹہ یا جیکب آباد ریفر کیا جاتا ہے اور اکثر وہ راستے میں ہی دم توڑ جاتی ہیں۔ تو ایسے میں سی پیک، سیندک اور ریکوڈک کے اثرات ان تک کیسے پہنچیں گے۔

معدنیات اور قدرتی وسائل کے معاملے میں بلوچستان مالا مال ہے لیکن ساتھ ہی ۱۹۹۲ سے کوئٹہ میں جو گیس پائپ لائن بچھی ہوئی ہے وہ ویسی کی ویسی ہی ہے۔ سردی کا آغاز ہوتے ہی مین شہر کوئٹہ، زیارت، قلات سمیت دیگر علاقوں میں گیس پریشر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ منفی دس درجہ حرارت پر ہم ٹھٹھرتے ہیں۔ ہمیں اس گیس کا کیا فائدہ۔ گیس ہی کی طرح ریکوڈک کا ہونا نہ ہونا ہمارے لیے ایک سا ہے۔ گیس بلوچستان سے نکلتی ہے وہاں سے شکار پور جاتی ہے، پھر ڈسٹری بیوٹ ہو کر ہمیں ملتی ہے۔ عدالتوں میں جائیں تو وہاں کیس نہیں چلتے۔ گیس پریشر کا ہمارا کیس یہاں کورٹ میں کب سے التواء میں پڑا ہے۔

گوادر کے حوالے سے سنا تھا کہ بڑی بڑی عمارتیں بنیں گی، اور بڑی ترقی ہو گی۔ وہاں جا کر گوادر میں ایک ماہی گیر سے کہا کہ اب تو تم بہت امیر ہو جاؤ گے تو کہنے لگا کہ ہمارا کھانا پینا مچھلی ہے، ہم صبح فجر کے وقت جاتے ہیں جال ڈالتے ہیں، یہی مچھلی ہمارا تین وقت کا کھانا ہے۔ یہ ترقی ہو گی تو یہ ساحل مجھ سے دور ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں کارڈ جاری ہوں گے اور کارڈ دکھا کر ہی ہم اپنے ساحل سے مل سکیں گے۔ یہ نام نہاد ترقی بلوچستان کی عوام کے لیے نہیں ہے۔ یہاں کے عوام کو صرف خواب دکھائے جاتے ہیں۔ سیندک میں ہمارا حصہ دو فیصد ہے۔ سوئی گیس سے ملک کے کارخانے چلے مگر ہمیں گھریلو استعمال کو بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح سی پیک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑا ترقیاتی منصوبہ ہے بلوچستان کا ۶۰ فیصد حصہ اس میں ہے لیکن ملے گا ہمیں وہی ۵ فیصد۔ بدقسمتی سے ہماری سیاسی پارٹیاں صرف بلیم گیم کھیل رہی ہیں جس کو جب چانس ملا اس نے اپنے حساب سے کام کیا۔ چاغی کے علاقے کے آس پاس لوگوں میں جلدی امراض پائے جاتے ہیں۔ ہماری زمین ایٹمی دھماکے کے لئے تو استعمال ہوئی لیکن اس کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے لوگوں کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ اس کے کیمیکل اثرات آج تک ہمارے بچوں کو متاثر کر رہے ہیں۔

تسلیم کرنا چاہیے کہ قوم پرست اگر اپنے حقوق کے لئے بولتے ہیں تو اس لئے کہ انہیں ان کے حقوق نہیں ملتے۔ اگر کوئی کام کرنے کے لئے آیا تو اسے بھی فری ہینڈ نہیں دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ بھی ڈھائی سال کے مختصر عرصے کے لیے آئے اور ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگاتے ہوئے اپنی عوام کے لیے یہ زہر [وزارت اعلیٰ] کا گھونٹ پیا۔ کیونکہ ۷۰ سال سے حکمران اسٹیبلشمنٹ کے سامنے کھڑا ہونا بہت مشکل ہے۔ اس وقت ہمارے دانشوروں اور سیاستدانوں کو بولنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اور جس طرح اپنے حق سے ہمیں محروم کیا جا رہا ہے اس کے لئے بولنا چاہیے۔ ہماری زمین پر آ کر ہمارے اثاثے لوٹے جائیں اور پھر کہا جائے کہ ہم بات بھی نہ کریں۔ اپنے حقوق کے لئے بات کرنا کوئی جرم نہیں ہے، یہ کسی قانون میں نہیں لکھا، پاکستان کے دستور میں بھی یہ نہیں لکھا۔ درحقیقت ہمیں فریڈم آف سپیچ حاصل نہیں ہے ہم ایک دوسرے کے سامنے چھپ چھپ کر تو بات کرتے ہیں لیکن کھل کر بات نہیں کر سکتے۔

سی پیک یا اس طرح کا کوئی اور بھی منصوبہ یا معاہدہ ہو جب تک اس میں بلوچستان کی ترقی کو شامل نہیں کیا جائے گا ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب کوئی معاہدہ کیا جاتا ہے تو اسے چھپایا کیوں جاتا ہے، سامنے کیوں نہیں لایا جاتا۔ آخر آپ نے چین کے ساتھ گوادر کے حوالہ سے جو معاہدہ کیا ہے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ نے گوادر کو بیچا ہے یا ویسے ہی دے دیا ہے۔ معاہدہ سامنے تو لائیں۔ ہمیں پتہ ہونا چاہیے۔ اس پر بحث اور پھر قانون سازی ہونی چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ پروجیکٹس کے لئے ملازمتوں کا اعلان کیا جاتا ہے تو تمام اچھی پوسٹس پنجاب کے لئے ہوتی ہیں اور چوکیدار خاکروب کی بلوچستان کے لئے۔ ہماری طرف سے اسے چیلنج کیا گیا تو پھر اگلی ایڈورٹائزمنٹ میں اوپن میرٹ کر دیا گیا۔ اگر اوپن بھی کرتے ہو تو بلوچستان کے لوگوں اور ان کے بچوں کے لئے کرو۔

جب تک وفاق کا رویہ انصاف پر مبنی اور سلوک برابری کی بنیاد پر نہیں ہوتا بات نہیں بنے گی۔ بلوچ سے اگر آپ اس کی سرزمین اور اس کے حقوق چھینتے ہو تو وہ بولتا ہے، اس پر اگر یہ کہا جائے کہ وہ محبِ وطن نہیں تو یہ کیسا انصاف ہے۔ اس نے اپنی مٹی کو دیکھنا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اسے پسماندہ رکھنے کی وفاق کی پالیسی انصاف اور انسان دوستی پر مبنی نہیں ہے۔ آپ کی اندرون ملک کی پالیسی ہو یا خارجہ پالیسی، سب مفادات پر مبنی ہے، آپ کے رشتے انسان دوستی پر نہیں مفادات پر مبنی ہیں۔ درحقیقت جبر اور نفرتوں کی بنیاد پر کہیں حکومت نہیں کی جاسکتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ بلوچ قوم اور عوام کو اس کے وسائل اور ساحل پر اختیار ہونا چاہیے، اسے ترقی کے ہر منصوبے اور معاہدے میں شامل ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر عبدالحئ بلوچ
سابق صدر نیشنل پارٹی،
سابق رکن قومی اسمبلی و سینیٹ

سب سے پہلے تو میں شکریہ ادا کرتا ہوں آئی پی ایس کا اور خالد رحمٰن صاحب کا۔ اس کے ساتھ اپنے تمام ساتھی شرکاء، دانشوروں کا بھی شکر گزار ہوں۔ کافی اچھا بحث و مباحثہ ہوا۔ ایسے سیمینار ہونے چاہییں۔ مگر جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ کہ جس نظام کے تحت ہم چل رہے ہیں ہم اس کو سمجھیں۔ اس کے بغیر ہم کوئی نتیجہ خیز مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے۔

پاکستان ایک کثیر القومی ریاست ہے مگر اس کے باوجود یہاں کا نظام ظلم و جبر اور حاکم اور محکوم کا نظام ہے اور جہاں محکومیت اور غلامی ہو وہاں محکوم قوم کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔ دنیا میں بدترین چیز یہ ہے کہ کوئی قوم غلام ہو۔ بلوچ ۷۰ سال سے اپنے حقوق سے محروم ہیں اور اب نہ صرف ان کے حقوق ان کو نہیں مل رہے بلکہ ان کی شناخت و ثقافت کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ اس وقت یہاں جو مختلف منصوبے جاری ہیں یہ سب پنجاب اور کراچی کے سرمایہ داروں کے ہیں۔ ان قبضہ گیری کی پالیسیوں سے بلوچستان کو کچھ نہ ملے گا۔ اس کے برعکس بلوچوں سے ان کی تاریخ، ثقافت کلچر سب چھینا جارہا ہے۔ ہم سے گیس لے گئے، بندرگاہ لے جارہے ہیں اور ان کو بلوچ سرزمین و وسائل درکار ہیں۔ اور اب ریاست اس قدر بربریت پر تلی ہوئی ہے کہ اس سرزمین پر بلوچ بھی نہ ہو۔ ایسے میں جدوجہد کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

جو کچھ ابھی ہو رہا ہے یہ پانچویں بار ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۸، ۱۹۵۸، ۱۹۶۲، ۱۹۷۳ اور ۰۶-۲۰۰۵ میں طاقت کا استعمال ہوا اور ابھی بھی ہو رہا ہے۔ آپ اسے مزاحمت یا بغاوت جو بھی کہیں اس کا سلسلہ اب ۷۰ سال سے جاری ہے۔ آخر کب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

دوسری جانب حکمران، اسٹیبلشمنٹ، جاگیردار، بیوروکریٹس اور موقع پرست ہیں۔ ان کے درمیان دولت کی ایک ریس ہے۔ اخلاقیات کہیں نظر نہیں آتی، ایک گیم ہے جس میں ان میں سے ہر ایک ہر حال میں اپنے مفادات کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک محکوم پولیٹی (polity) بنایا گیا ہے ایسے میں یہاں سیاسی، معاشی، ثقافتی بحران تو ہوگا۔ آپ چاہتے ہیں کہ ایک محکوم قوم اپنی زمین، اپنی حق حاکمیت اور اپنی ثقافت سے دستبردار ہو جائے۔ ظاہر ہے اس کے لیے کوئی تیار نہیں۔ کیا آپ طاقت کے ذریعے اس کا زور توڑ سکیں گے؟ وہ قوم جو اپنی سرزمین کے لیے سینہ سپر ہو جاتی ہے ان کو دنیا کی کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔ ہاں وہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں جو دوسرے نظام کو قبول کر لیتی ہیں اور اپنا سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ جو مزاحمت کرتی ہیں اپنا آپ بچا لیتی ہیں۔

دوسری جانب حکمرانوں کا بھی ایک مائنڈ سیٹ ہے کہ جو مزاحمت کرے گا اسے کچل دو، چاہے وہ قوم ہو، معاشرہ ہو یا کوئی اور طاقت۔ بلوچ اب اس بربریت اور ظلم کے عادی ہو چکے ہیں۔ بلوچوں میں سے کوئی نہیں بچا۔ ڈاکٹر، وکیل، پروفیسر اور انجینئر ہر طبقہ کے لوگ شہید ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہم کسی پالیسی میں شریک نہیں۔ ہمیں کچھ پتا ہی نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں کچھ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ آپ ہمیں نہ قوم سمجھتے ہیں نہ قبائل۔

پاکستان میں حقیقی جمہوریت ہونی چاہیے جس میں وفاق ہی سب کچھ نہ ہو۔ وفاق میں اکائیاں رضاکارانہ طور پر اپنے کچھ اختیارات وفاق کو دیتی ہیں لیکن یہاں کیا ہو رہا ہے؟ اب تو تمام جنگی طریقے استعمال کرنے کے بعد بلوچ قومی تحریک کو مذہبی شکل دینے کی کوشش کی گئی کہ یہ شیعہ سنی لڑائی ہے تاکہ عالمی سطح پر یہ تاثر دیا جاسکے کہ یہ بلوچ قوم پرستی کا مسئلہ نہیں، یہاں تو مذہبی بنیادوں پر سب کچھ ہو رہا ہے۔ گوادر میں اب کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اپنی سرزمین پر جہاں ہم صدیوں سے رہ رہے ہیں آزادی سے چلنے پھرنے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ آتے جاتے ہمیں پوچھا جاتا ہے کہ کون ہو؟ آپ کو صرف ہماری سرزمین چاہیے جو وسائل سے مالا مال ہے۔ پینے کو پانی نہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ ہماری ترقی اور خوشحالی ہے۔ ہمارے منہ کا نوالہ بھی ہم سے چھینا جا رہا ہے۔ اسی طرح سے لینڈ گرینبگ کا معاملہ ہے۔ اور ماڑہ پورا کنٹونمنٹ ایریا ہے۔ اسی طرح سے گوادر سے لے کر لیاری تک کوسٹل ہائی وے کے ساتھ پورے ساحل کو لیں۔ مجھے آپ بتائیں کہ یہ ہماری ترقی ہو رہی ہے یا آبادکاروں کے لیے سارا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے لوگ پہلے سے ڈسے ہوئے ہیں۔ پٹ فیڈر کینال جب آیا تو فیصل آباد سے بڑی تعداد میں لوگوں کو لایا گیا۔ ان کے نام پر لینڈ ریکارڈ بنایا گیا۔ بڑی مشکل سے اور بڑی مزاحمت کے بعد یہاں سے وہ لوگ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ لوگوں کو ہماری زمین چاہیے۔ کیونکہ یہ وسائل سے مالا مال ہے اور اس کی جیوپولیٹیکل اہمیت ہے۔

اس دھرتی کے لوگ خوش قسمت ہیں کہ اللہ پاک نے انہیں سب کچھ دیا ہے اور یہ اس طرح بھی خوش قسمت ہیں کہ یہ اپنی دھرتی کے لیے لڑنا مرنا اور اس پر جان قربان کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی جانوں کا نذرانہ دیتے ہوئے پروا نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ حکمرانوں کو سمجھنا چاہیے کہ جو طریقہ انہوں نے روا رکھا ہوا ہے اس سے انہیں کامیابی نہیں ملے گی۔ سی پیک کے حوالے سے یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ چینیوں کی پالیسیوں سے ساری دنیا بیزار ہے۔ ان کے اپنے ہمسائے ان سے بیزار ہیں۔ تائیوان، ویت نام، تھائی لینڈ کوئی بھی ان سے خوش نہیں ہے۔ hegemony اور dominance کی پالیسی کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ انہیں ہمیشہ مزاحمت ملتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو محکوم بلوچ اور پشتون ہیں یہ اپنی سرزمین کے لیے لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایسا سمجھتے ہیں کہ سی پیک کے ذریعہ یہاں پنجابیوں کو آباد کیا جائے گا۔ ویسے بھی چینی جہاں بھی جاتے ہیں اپنے ہی لوگ ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ یہاں بھی اپنے لوگ ساتھ لائیں گے جیسے ابھی ذکر ہوا کہ گوادر پر کام کرنے والی کمپنیوں کے سوپر بھی چائنیز ہیں۔ تو کوئی قوم کس طرح اپنی بربادی کو دیکھے گی۔ ہم جدوجہد کرتے رہیں گے اور یہ بھی سمجھ لیں کہ ہم کوشش کرتے رہیں گے کہ دوسری محکوم قومیں بھی اس جدوجہد میں شامل ہوں۔

دوسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ بلوچستان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ ایک گیٹ وے ہے جس سے پوری دنیا کو راستہ جائے گا۔ اس لیے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جو اس طرح سے حل نہیں ہو گا جیسے ہمارے حکمران سمجھ رہے ہیں۔ یہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سی پیک کا معاہدہ سیکرٹ ہے۔ کسی کو اس کی شرائط کا کچھ پتا نہیں ہے۔ یہ جو ۵۰ ارب ڈالر ہیں اس کا حساب کتاب کیا ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اگر یہ عوام کے مفاد کے لیے ہے تو اسے سیکرٹ رکھنے کا آخر کیا مطلب ہے؟

بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے سیاست دان جو ہمارے بڑے ہیں اور بڑی بڑی پارٹیاں ہیں، کوئی سٹینڈ لینے کے لیے تیار نہیں۔ خدا کے لیے کسی ایک چیز کے لیے تو کھڑے ہو جاؤ۔ قومی سوال کو چھوڑو، یہ جو جمہوریت ہے یہ تو آپ کے فائدے کے لیے ہے لیکن اس کے لیے بھی کھڑے نہیں ہوتے۔ سیاست کو کاروبار بنایا ہوا ہے۔ اس اسٹیٹس کو (status quo) اور نظام کو بدلنا ہو گا۔ یہ ایک کمزور نظام ہے۔ اس میں ان قوتوں کا اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔

آخر میں میں یہ بات کروں گا کہ یہ جو مردم شماری کرائی جا رہی ہے اس پر بھی ہمارے تحفظات ہیں۔ آپریشن کی وجہ سے بلوچستان کی بہت سی آبادی اپنا گھر بار چھوڑ چکی ہے۔ اب خالی گھروں میں آپ کس کو شمار کرنا چاہتے ہیں اور کیسے کریں گے۔ دوسری جانب آپ افغان مہاجرین کو واپس بھیجیں یا کچھ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ وہ صرف کیمپوں تک محدود رہیں۔ بدقسمتی سے اس پر بھی کچھ نہیں کیا جا رہا، کوشش کی جا رہی ہے کہ ہمیں دبا دیا جائے۔ ہم بھی انسان ہیں، مسلسل آپ کے ظلم اور آپ کی زیادتیاں سہہ رہے ہیں۔ اب آپ اپنے منصوبوں سے ہماری زمین پنجاب والوں کو بیچ رہے ہیں۔ گوادر ہمارا ہے، بلوچستان ہماری سرزمین اور ہماری ماں ہے، یہ ہماری اجتماعی ملکیت ہے۔ اس کو بیچنے کا اختیار ہم کسی کو نہیں دے سکتے۔ شکریہ

اختتامی کلمات

خالد رحمٰن
ایگزیکٹو پریذیڈنٹ
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
اسلام آباد

اس سیمینار کے حوالے سے ہماری یہ کوشش تھی کہ بلوچستان کے حالات، معاملات و مسائل سے متعلق غیر حکومتی نقطہ نظر کو سنا اور سمجھا جائے اور پالیسی سازی پر علمی و تحقیقی ادارہ کی حیثیت سے ان آوازوں کو پالیسی سازوں اور دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد اور اداروں تک پہنچایا جاسکے۔ اس طرح ایک دوسرے کو سننے اور سمجھنے کا عمل آگے بڑھے اور نتیجہ خیز مکالمہ کی گنجائش پیدا ہو۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس پروگرام میں سیاسی، صحافتی، دانش وراور سول سوسائٹی سمیت ہر طبقہ فکر کے بیباکانہ اظہار خیال سے بلوچستان کے مسائل نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں*۔

میں بہت شکر گزار ہوں آپ سب لوگوں کا کہ آپ تشریف لائے۔ گزشتہ کم و بیش ۳۸ سالوں میں ہم نے سینکڑوں سیمینار منعقد کیے ہیں۔ ان سیمینارز میں ہر طرح کے لوگ شریک ہوتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس انداز میں صبر کے ساتھ، مہذب انداز میں اور ایک دوسرے کا احترام برقرار رکھتے ہوئے آپ سب نے آج کے سیمینار میں گفتگو کی ہے، ایسے مواقع بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ اگر مل بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا عمل ہو تو چیزوں کو بہتر انداز میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ یہاں کھل کر گفتگو ہوئی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ شرکاء میں سے کسی نے بھی اپنے خیالات اور احساسات کے بیان میں تکلف سے کام نہیں لیا۔ دوسری جانب اصلاح احوال کے لیے تجاویز بھی بیان ہوئی ہیں۔ میں نے کم و بیش ہر فرد کی گفتگو کے اہم نکات کو نہ صرف اپنے پاس نوٹ کیا ہے بلکہ یہ کوشش بھی کی ہے کہ نکات کو انہی الفاظ میں لکھوں جن الفاظ میں آپ نے بیان کیا ہے۔ دوسری جانب جیسے صبح بھی ذکر کیا گیا تھا کہ ہم نے اس پوری کارروائی کو ریکارڈ بھی کیا ہے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ساری کارروائی کو دوبارہ بھی سنوں گا تاکہ آپ نے جو بات جس لب ولہجہ میں کہی وہ زیادہ اچھی طرح سے واضح رہ سکے۔

سیمینار کی ابتدائی گفتگو میں میں نے عرض کیا تھا کہ ہم سیمینار کے حوالہ سے جب کوئی بات لکھیں گے یا لکھنا چاہیں گے تو کسی کے نام کے ساتھ منسوب نہ کریں گے۔ تاہم دن بھر کارروائی سننے کے بعد مجھے اس میں کوئی مضائقہ نہیں لگتا کہ اس سیمینار کی رپورٹ میں آپ کی گفتگو آپ کے نام کے ساتھ آئے۔ اس کے لیے میں آپ کی اجازت لینا چاہتا ہوں اور اسی لئے میں نے اس دوران یہ اہتمام کیا ہے کہ آپ

* یہ اختتامی کلمات سیمینار میں کی جانے والی گفتگو پر مبنی ہیں تاہم یہاں انہیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

کی بات کو بالکل ایسے ہی جیسے آپ نے کہا ہے لکھ لیا جائے۔ اس کے نتیجے میں جن لوگوں سے بھی ہمیں بات کرنے کا موقع ملے گا ہم آپ کی بات کو آپ ہی کے الفاظ میں پیش کر سکیں گے۔ اس طرح الفاظ ہی نہیں جس لب و لہجے میں اور جن جذبات کے ساتھ بات کہی گئی ہے اسے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ اس میں کچھ ایڈیٹنگ بھی کرنی ہو گی جو کسی بھی زبانی گفتگو کو تحریر میں ڈھالتے ہوئے ناگزیر ہے۔

مجھے احساس ہے کہ دن پورا گزر گیا ہے آپ لوگوں نے جانا بھی ہو گا۔ تاہم میں چاہوں گا کہ چند خیالات جو آپ کی گفتگو سننے کے بعد ذہن میں آتے ہیں مختصراً آپ کے سامنے پیش کر دوں۔

جناب لہڑی صاحب اور بعض دوسرے لوگوں نے بھی کہا مجھے ان کی بات بہت اچھی لگی جسے میں دہرانا چاہتا ہوں! کہ کیا بلوچستان میں ہونے والے ظلم کا ذمہ دار عام پنجابی ہے۔ ظاہر ہے پنجاب کا عام شہری تو خود بھی مظلومیت کا شکار ہے۔ بلاشبہ ہمیں دیکھنا ہو گا کہ کسی مسئلہ کی ذمہ داری کسی خاص نسل کے لوگوں پر عائد کرنا کیا کوئی درست رویہ ہو سکتا ہے؟ اسی ضمن میں یہاں گیس کی لوڈشیڈنگ کی بات کی گئی۔ یہ درست ہے لیکن ذاتی تجربات کی بنیاد پر میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ چند سالوں سے بالخصوص سردی کے مہینوں میں تو گیس کی لوڈشیڈنگ اسلام آباد کے اعلیٰ ترین سیکٹروں میں بھی ہو رہی ہے۔ اس تناظر میں مجھے اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ پورا ملک دو طبقوں میں تقسیم ہے۔ ایک وہ اشرافیہ ہے جو خواہ کسی بھی جگہ ہو اسے ساری سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ دوسری جانب ایک عام شہری ہے۔ زبان، نسل اور علاقہ سے قطع نظر وہ جہاں بھی ہو مشکلات کا شکار ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ عام آدمی کا الائنس بنایا جائے۔ عام آدمی کا یہ الائنس نہیں بنے گا تو ہمارے ملک میں تقسیم در تقسیم تو ہو سکتی ہے لیکن اس عام آدمی کے مسائل حل نہ ہوں گے۔

اسی صورت حال کی عکاسی ان دنوں فاٹا میں ہو رہی ہے۔ ہم نے پچھلے چار مہینوں میں فاٹا کے لوگوں کے ساتھ مل کر کئی نشستیں کی ہیں۔ ان نشستوں کی رپورٹ بھی بنائی گئی اور متعلقہ لوگوں کے ساتھ شئیر بھی کی گئی۔ یہاں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو باتیں بلوچستان کے بارے میں آپ نے کی ہیں کہ مثلاً بلوچستان کو سیکیورٹی کی عینک سے دیکھا جاتا ہے، یہاں ہر تھوڑے فاصلے پر چوکی ہے، اچھے سے اچھے عزت دار آدمی کو روکا جاتا ہے اور موقع پر موجود اہلکار اس کی بے عزتی کرتا ہے، کم و بیش یہی باتیں اس سے زیادہ شدت کے لب و لہجے میں فاٹا کے لوگوں سے ہم نے سنی ہیں اور ان میں فاٹا سے تعلق رکھنے والے سابق سفارت کار، فوجی افسران اور سیاست دان سب ہی شامل ہیں۔ اس طرزِ عمل کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جنگ اور تشدد کے ماحول میں سیکیورٹی اہلکاروں کا عام آدمی کے ساتھ ہینڈلنگ کا طریقہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ سیاہ اور سفید یا دشمن اور دوست کی بنیاد پر لوگوں کو تقسیم کرتے ہیں اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ اہلکار مقامی ہوں تو مخاطب اس طرح شدت سے ان کے توہین آمیز رویہ کو محسوس نہیں کرتا جس طرح دوسرے علاقے سے ہونے کی صورت میں محسوس کرتا ہے۔

اسی طرح محکوم لوگ اور محکوم قوم کی بات کی جاتی ہے، میرے خیال میں یہ بھی پورے ملک میں موجود ہے۔ زمینوں کے حوالہ سے قبضہ مافیا کہیں اور نہیں اسلام آباد میں سر گرم ہے۔ وہاں بھی سوال یہ اٹھتا ہے کہ بیچنے والے کیوں بیچ رہے ہیں اگر خریدنے والے کہیں اور سے آرہے ہیں۔ یوں یہ ایشوز پورے ملک کے ہیں جن کو اس انداز میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اس مجموعی تناظر میں سیمینار کی بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مسائل یقیناً موجود ہیں اور چھوٹے بڑے ہر نوعیت کے ہیں۔ تاہم مسائل کے اسباب اور مختلف فیصلوں کے پیچھے نیت کا تعین شاید اس قدر آسان نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ارادی و غیر ارادی، شعوری ولاشعوری ہر دو طرح کے پہلو موجود ہو سکتے ہیں جبکہ انفرادی و گروہی مفادات بھی ایک حقیقت ہیں۔ مگر اس بات سے صرف نظر کر کے اور ان پیچیدگیوں کو سمجھے بغیر ایک دوسرے کی نیتوں پر شک کرنے سے بداعتمادی جنم لیتی ہے جو کہ خود ایک بڑا مسئلہ اور مسائل کے حل میں رکاوٹ ہے۔ مزید یہ کہ مسائل کو سمجھنے کے لیے حالات وواقعات کو مکمل تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی مختلف تہوں اور جہتوں کو سمجھا جا سکے۔

دوسری جانب مسائل مقامی سے لے کر قومی اور بین الاقوامی ہر ایک نوعیت اور سطح کے ہیں۔ بعض مسائل بلوچستان کے خصوصی حالات کی وجہ سے خالصتاً بلوچستان سے متعلق ہیں جبکہ بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں جو نہ صرف بلوچستان بلکہ ملک بھر میں یکساں یا پھر شاید بعض صورتوں میں بلوچستان سے بھی شدید نوعیت میں دیگر جگہوں پر موجود ہوں گے۔ اسی طرح بعض مسائل خطے کی صورت حال، عالمی حالات اور ان سے متعلقہ عناصر کی صف بندیوں اور اقدامات کی وجہ سے جنم لے رہے ہیں۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ فرداً فرداً مسائل پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ مجموعی پس منظر میں مسائل کی پیچیدگیوں کو سمجھا جائے اور اسی کے مطابق رابطہ کاری اور شراکت داری سے مسائل کا حل نکالا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات جب ملکی نظام اور سرحدوں کے اندر حل نہ ہو رہے ہوں تو بیرونی قوتوں کو ان سے فائدہ اٹھانے اور اپنے کھیل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ عالمی طاقتوں اور یہاں متحرک بیرونی قوتوں کو نہ تو بلوچوں سے محبت ہے اور نہ ہی پاکستان سے۔ سب اپنے اپنے مفادات کے تابع ہیں اور انہی مفادات کے حصول کے لیے دوسروں کی سرزمین، حالات اور مسائل کا استعمال کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ پاکستان جس خطے میں قائم ہے وہاں اپنے ہمسایوں کے ساتھ اس کے تعلقات بوجوہ مثالی نہیں ہیں۔ بھارت کے ساتھ قیام پاکستان کے بعد سے ہی کشمیر سمیت دیگر مسائل کی وجہ سے تعلقات نہ صرف خراب رہے ہیں بلکہ کئی دفعہ تصادم کی صورت بھی اختیار کر چکے ہیں۔ افغانستان کے ساتھ بھی ڈیورنڈ لائن (پاک افغان سرحد) ایک وجہ تنازعہ رہی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی وجہ گزشتہ کم و بیش چار دہائیوں سے وہاں جاری جنگ اور خانہ جنگی ہے جس کی بناء پر تعلقات مشکلات کا شکار رہے ہیں۔ افغانستان کی صورت حال اور دیگر علاقائی اور مسلکی پیچیدگیوں نے ایران کے ساتھ تعلقات کو بھی اتار چڑھاؤ کا شکار کیے رکھا ہے۔ اس سلسلے میں حالیہ دنوں میں کلبھوشن یادیو (بھارتی جاسوس) کی ایران میں موجودگی اور بعدازاں گرفتاری نے کئی سوالات کو جنم دیا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کی چین سے قربت اور گوادر میں چین کی موجودگی کو اپنے معاشی واسٹریٹجک مفادات کے لیے خطرہ سمجھنے والی قوتیں بھی یہاں

کے مقامی تنازعہ سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے میں ضرورت اس چیز کی ہے کہ اندرونی معاملات و مسائل کا حل ہم خود ہی نکال لیں بجائے اس کے کہ بیرونی قوتیں انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کریں۔

سی پیک کے حوالے سے ایک نقطہ نظر جو سامنے آیا ہے اس میں وزن ہے۔ یعنی یہ کہ کہنے کو تو سی پیک ہمارے (بلوچستان) نام پر بنایا جا رہا ہے لیکن اس میں ہمارے لیے جو کچھ ہے اس کی وجہ سے بہت ساری قوتیں ہماری طرف متوجہ ہو رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا پھر سی پیک سے انکار کر دیا جائے یا سی پیک کو صحیح طرح negotiate کیا جائے کہ قومی مفاد، بلوچستان کے مفاد اور گوادر کے مفاد میں کوئی تصادم نہ ہو۔ اس لحاظ سے میں کم از کم یہ سوچتا ہوں کہ بہتر طریقے سے negotiate کرنا اصل آپشن ہے۔ یہ سوال بھی پوچھا جانا چاہیے کہ اگر negotiate درست طور پر نہیں ہو رہا تو کیا اس میں ہر صورت میں بدنیتی ہی شامل ہے؟ یا یہ صورت حال ہمارے ملک میں خراب اور نااہل حکومتی کارکردگی (گورننس) کے مسائل ہی کی ایک اور جھلک ہے۔

مجھے آپ کی اس شکایت کا پورا احساس ہے میں اسے تسلیم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے کے لیے ماضی سے سبق لینا ہوگا۔ تاہم جب میں نے negotiation کی بات کی تو میری مراد بیرونی ممالک سے ہے۔ جب ہم کہتے ہیں امریکہ کی بھی خواہش ہے کہ گوادر اس کا ہو جائے، روس اور چین کی بھی یہ خواہش ہے تو یہ ہمارے لیے اپنے حق میں negotiation کا ایک اچھا موقع اور راستہ فراہم کرتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس کے بجائے اس راستہ کو بند کرنے اور روکنے کی جدوجہد کی جائے تو کیا یہ تمام لوگ رک جائیں گے؟ اس تناظر میں بہتر ہے کہ ہم negotiation اپنے مفاد میں کرنے کی کوشش کریں۔ میں یہ سوال چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ ہم اس پہلو سے بھی چیزوں کو دیکھیں۔

[ڈاکٹر عبدالحئ بلوچ: جن کے پاس اختیارات ہیں وہ تو ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالتے۔]

شاید میں اپنی بات ٹھیک طریقے سے کہہ نہیں پایا۔ اشارہ اس جانب نہیں تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں یہاں بلوچستان میں بیٹھ کر یہ احساس ہو رہا ہے کہ پنجاب اس سے بہت فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری حکومت کی بالعموم پوری تیاری نہیں ہوتی جبکہ چین کا ہوم ورک غیر معمولی ہوتا ہے۔ مذاکراتی عمل میں جو فریق ہوم ورک کر کے آ رہا ہو اس کے لیے اپنی شرائط منوانا آسان ہو جاتا ہے بالخصوص دوسری جانب نہ تو دفاتر میں عملہ پوری طرح اہل ہو، نہ ہی معلومات اور قابل اعتماد اعداد و شمار دستیاب ہوں، اور سب سے بڑھ کر سیاسی دائرہ میں عدم استحکام ہو۔ negotiation کی بات کرتے ہوئے میرا اشارہ اس طرف تھا۔

بدقسمتی سے ہمارا سیاسی کلچر بھی نااہلی کی ایک وجہ ہے جس میں قومی سطح پر فیصلے انتخابی ضروریات کے تناظر میں طے پاتے ہیں۔ ہماری حکومت کی اول و آخر خواہش یہ ہوتی ہے کہ ۲۰۱۸ کے انتخاب سے پہلے پہلے جو کچھ ہو سکتا ہے اور جس کا کریڈٹ ہمیں مل سکتا ہے وہ کروالو خواہ ملکی اور قومی نقطہ نظر سے وہ اولین ترجیح بھی نہ ہو۔ اسی تسلسل میں پھر یہ زیادتی ہوتی ہے کہ اگر بلوچستان میں انتخاب نہیں لڑنا تو انہیں یہاں کسی خاص

کام سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔negotiation میں ہماری حکومتوں کے اس رویہ سے دوسرے فریق (چینیوں) کو اپنی شرائط طے کرانے میں کامیابی ہو جاتی ہے۔

یہاں کسی دوست نے یہ بات کہی کہ ہمارے لیے سی پیک صرف یہی رہ جائے گا کہ ہم لوگ چائے خانہ یا پنکچر کی دکان کھول لیں۔ میرا خیال ہے آپ نے بالکل ٹھیک تبصرہ کیا ہے۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے تاہم آج سے چند سال کے بعد دنیا میں جو کچھ ہونے جا رہا ہے اسے پیش نظر رکھ کر کام شروع کیا جائے تو بعید نہیں کہ آج کے چائے خانے کو کل کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈھالا جا سکتا ہو۔ دنیا میں کتنی ہی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا آغاز اسی طرح ہوا ہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو مواقع کو جس شکل میں مل رہا ہو اسی شکل میں استعمال کر کے اسے ملٹی پلائی کرنے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ در حقیقت مواقع کئی طرح کے ہوتے ہیں اور ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے انفرادی، اجتماعی، سول سوسائٹی کی سطح پر اور سول گروپس کے ذریعے کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

سیمینار کے اختتام پر ہمیں چند نکات پر اتفاق کر لینا چاہیے۔

پہلی یہ کہ صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھا نہیں جا سکتا یعنی status quo مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ دوسری جانب مایوسی بھی کوئی آپشن نہیں ہے۔ **دوسری** یہ کہ ہم کو ایک پیچیدہ صورت حال کا سامنا ہے جس کے اسباب اور مظاہر میں انتظامی، اقتصادی، سیکوریٹی، سیاسی، علاقائی، قبائلی اور بین الاقوامی عوامل شامل ہیں۔ کسی جامع حل کی طرف پیش رفت کے لیے ہمہ پہلو کام کرنا ہو گا۔ **تیسری** یہ کہ صورت حال کا بگاڑ کئی عشروں پر محیط ہے اسے حل کرنے کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہو سکتا۔ ۷۰ سال کی جو خرابیاں ہیں اور جس طرح سے مسائل کو پیچیدہ کر دیا گیا ہے، ان پیچیدہ مسائل کے لئے ہم نے مناسب ہوم ورک کیے بغیر حل نکالنا بھی چاہا تو حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو جائے گا۔

اس پس منظر میں **چوتھی** اہم بات یہ ہے کہ مسائل کے مستقل اور پائیدار حل کے لیے موثر راستہ بات چیت اور مذاکرات ہی کا ہے۔ اس راستہ کو اختیار کرنے کے باوجود حادثات کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا لیکن مکالمہ کے لیے موثر ادارتی میکنزم جو آئینی و سیاسی بنیادوں پر تشکیل دیا گیا ہو وہ ان حادثات کے باوجود مذاکراتی عمل کی کامیابی کو یقینی بناتا ہے۔ اسی سے جڑی **پانچویں** اہم بات یہ ہے کہ طاقت کا استعمال چاہے وہ کسی بھی طرف سے ہو ہر گز مسائل کا حل نہیں بلکہ نئے مسائل کو جنم دینے کا باعث ہے۔ طاقت کے ذریعے مسائل حل کرنے کی روش کے نتیجے میں عمل اور رد عمل کا نہ رکنے والا سلسلہ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تلخیاں معاملات کو مزید گھمبیر تو بنا دیتی ہیں مگر حل کی جانب نہیں لے جاتیں۔ جدوجہد کرنے والے کے لیے قربانی بذات خود ایک آپشن ہے۔ لیکن یہ تو ایک نہ ختم ہونے والا پراسس ہو گا جس میں ہر دو طرف کے لوگ اپنے اپنے تئیں قربانیاں دیتے رہیں گے۔ اسی تناظر میں ہمیں جب کہیں موقع ملتا ہے تو ہم دوسرے فریق سے بھی بات کرتے ہیں۔ آج کی نشست کے بعد اور بھی زیادہ شدت سے بات کریں گے کہ سلامتی کے ذمہ داران کو یہ جاننا چاہئے کہ سلامتی دراصل انسانوں کو دینی ہے۔ علاقے کی سلامتی کی کیا اہمیت اگر آپ علاقے کی سلامتی میں انسانوں کی سلامتی کو برباد کر دیں۔

آخری اور اہم ترین بات، جس کی جانب پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے، یہ ہے کہ بلوچستان ہی کی طرح ملک کے بہت سے دیگر حصوں کے باشندوں کے بھی متعدد مسائل ہیں۔ درحقیقت پنجاب اور سندھ ہو یا خیبر پختونخوا، تمام ہی صوبوں میں آبادی کا ایک بڑا حصہ محرومیوں کا شکار ہے جبکہ ان صوبوں میں بالادست طبقات ہی کی طرح بلوچستان میں بھی بالادست طبقات ہیں۔ یوں یہ معاملات کسی مخصوص علاقے یا قوم کے بجائے ملک بھر کے پسماندہ طبقات کے مسائل ہیں۔ ایک طرف کچھ لوگوں کے پاس زندگی کی بہترین سہولیات ہیں اور دوسری طرف عوام کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں ہو رہی ہیں۔

اس صورت حال کے بہت سے اسباب گنوائے جا سکتے ہیں لیکن یہ عدم مساوات اصلاً موجودہ استحصالی نظام کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ ان مسائل کے حوالے سے اپنی محرومیوں کی آواز کو ملک کے دیگر محروموں کی آواز سے ملا کر مشترکہ جدوجہد کی جائے تو شاید یہ آواز مزید موثر اور توانا ہو کر ابھرے۔ اس طرح کے کسی بھی وسیع تر اشتراک، مذاکرات اور اعتماد سازی کے لیے ضروری ہے کہ بلوچستان سمیت پورے ملک میں جو سیاسی عمل چل رہا ہے اس میں توڑ پھوڑ کی بجائے اسی میں سے حالات کی بہتری کے لیے مدد اور تعاون کی راہیں تلاش کی جائیں۔ ایسے میں تمام اسٹیک ہولڈرز کو چاہیے کہ وہ طاقت کے استعمال کے بجائے بات چیت کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کریں۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ طاقت کے استعمال کا سلسلہ اگر جاری رہتا ہے تو اس سے سب سے زیادہ متاثر بلوچ ہی ہوں گے۔ ایسے میں اگر تلخیوں کو پس پشت ڈال کر طاقت کی بجائے نیک نیتی کے ساتھ بات چیت کے ذریعے مسائل کے حل کی کوئی صورت پیدا کی جائے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ بہت سے مسائل سے نجات حاصل کرتے ہوئے رفتہ رفتہ بڑے مسائل اور تضادات کے حل کے لیے تعاون کی راہ ہموار ہو۔

موجودہ حالات میں بات چیت کے ایک پائیدار عمل کے آغاز کے لیے پہلے اعتماد سازی کے اقدامات لینے ہوں گے، ایک دوسرے کو وضاحت اور شکایت کا موقع دینا ہوگا تاکہ دونوں طرف سے برف کے پگھلنے اور فاصلوں کے کم ہونے کی صورت پیدا ہو جو بات چیت اور باقاعدہ مذاکرات کے لیے سہولت کا باعث بنے۔ اس کے لیے ہمیں چھوٹے بڑے ہر درجے کے اقدامات لینے ہوں گے تاکہ ان کے سلسلہ وار اثرات اعتماد سازی کے لیے کارگر ثابت ہوں۔

آج کے سیمینار میں دو اور اہم باتیں میں نے علیحدہ سے نوٹ کر لی ہیں کہ ان پر غور و فکر کے بعد ایک مہم کی صورت میں آگے بڑھانا چاہیے۔ ایک یہ کہ ہم صوبوں میں اور صوبوں کی نمائندگی میں توازن کیوں کر پیدا کریں؟ یہ خدشہ موجود ہے جس کی جانب یہاں اشارہ کیا گیا کہ پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں تو سینٹ میں ان کی تعداد بھی دوگنا بڑھ جائے گی۔ ظاہر ہے اس پر سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ موجودہ انتظام میں توازن نہیں ہے۔ طویل المیعاد عرصہ میں اس کو سوچنا ہوگا کہ یہ عدم توازن کیسے ہوا اور اب کس طرح دور ہو سکتا ہے۔

دوسری بات سول سوسائٹی کے کردار سے متعلق ہے۔ حقیقت میں سول سوسائٹی میں سب ہی طرح کے لوگ ہیں۔ بعض تو بالکل ہی منفی ایجنڈے کو لے کر چل رہے ہیں۔ ان کے پاس بے شمار ایسے عنوانات ہیں جو ہماری سماجی اقدار کو ہدف بنا رہے ہیں اور معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ کا سبب بن رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے لوگ برے ہیں لیکن پاکستانی معاشرہ کی حقیقی اقدار سے وابستہ سول سوسائٹی کو ہمیں تشکیل

دینا ہے اور اس کے ذریعہ معاشرے کے مختلف طبقات کو قریب تر لانا ہے۔ حکومتوں پر بھی اسے اثرانداز ہونا ہوگا لیکن کسی بیرونی ایجنڈے کی بنیاد پر نہیں بلکہ قومی مفادات کے تناظر میں۔

* * *

فہرست شرکائے سیمینار

محمد اسلم بھوتانی	سابق اسپیکر، بلوچستان اسمبلی [۲۰۱۲-۲۰۰۸]
عبدالحکیم بلوچ	سابق چیف سیکریٹری بلوچستان
امان اللہ کنرانی ایڈووکیٹ	سابق سینیٹر، ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان
منیر احمد بادینی	سابق چیف سیکرٹری حکومت پاکستان، سیکریٹری تعلیم حکومت بلوچستان
ڈاکٹر اسحاق بلوچ	سیاسی رہنما ورکن مرکزی کمیٹی نیشنل پارٹی
قاضی عبدالحمید شیرزاد	ایڈووکیٹ ہائی کورٹ
شام کمار	دانشور اور مصنف
یار جان بادینی	دانشور اور صحافی
صدیق بلوچ	ایڈیٹر، روزنامہ آزادی وڈیلی بلوچستان ایکسپریس
امین اللہ فطرت	اسٹاف رپورٹر روزنامہ جنگ کوئٹہ
عبدالروف مینگل	رہنما نیشنل پارٹی بلوچستان [مینگل] سابق رکن قومی اسمبلی ۲۰۰۶-۲۰۰۲
ہدایت الرحمٰن بلوچ	سیکریٹری جنرل، جماعت اسلامی بلوچستان
منظور بلوچ	لیکچرار، بلوچستان یونیورسٹی
فاروق سرور	ایڈووکیٹ، لکھاری
امان اللہ شادیزئی	دانشور وصحافی، صدر بلوچستان یونین آف جرنلسٹ
سلیم شاہد	صحافی، ڈان نیوز
صابرہ اسلام ایڈووکیٹ	نیشنل پارٹی
ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ	سابق صدر نیشنل پارٹی، سابق رکن قومی اسمبلی [۷۷-۱۹۷۰] وسابق سینیٹر [۱۹۹۷-۲۰۰۰]

جمعہ خان گاجانی	سابق ناظم
راہب خان بلیدی ایڈووکیٹ	چیئرمین، ایگزیکٹو کمیٹی بلوچستان بار کونسل
حاجی عطاءاللہ لانگو ایڈووکیٹ	وائس چیئرمین، بلوچستان بار کونسل
نصیر احمد بنگلزئی ایڈووکیٹ	ہائی کورٹ بلوچستان
ساجد ترین ایڈووکیٹ	ہائی کورٹ بلوچستان
سلیم لاشاری ایڈووکیٹ	ہائی کورٹ بلوچستان
اصغر پانیزئی ایڈووکیٹ	ہائی کورٹ بلوچستان
جمیل آغا ایڈووکیٹ	ہائی کورٹ بلوچستان